

[illegible]

1900

0.

A large, bold, black calligraphic character, likely a stylized 'K' or 'G', rendered in a traditional East Asian style. The character is composed of thick, expressive strokes with sharp, pointed terminals. It is set against a light beige, textured background.

قیمت فی کاپی ۱۰۱

# تصانیف نیاز فوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کرنے والی  
انجیل انسانیت

## ”من ویز داں“

مولانا نیاز فوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک  
غیر فانی کارنامہ جس میں سلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع  
انسانی کو انسانیت کبریٰ و اخوت عامہ کے ایک شتہ سے وابستہ  
ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقائد  
رسالت کے مفہوم اور صحایف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی  
اخلاقی اور نفسیاتی نقطہ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پر زور  
خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔

ضخامت ۳، ۶ صفحات۔ مجلد سات روپیہ آٹھ آنے (معبر)  
علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات  
یعنی

## من ویز داں کا دوسرا حصہ

اس حصہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے انکی  
مختصر فہرست یہ ہے۔ ۱۔ اصحاب کہف۔ معجزہ و کرامت۔  
انسان مجبور ہے یا مختار۔ مذہب و عقل۔ طوفان نوح۔  
خضر کی حقیقت۔ مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں۔ یوش اور ہان  
ماہی۔ حسن یوسف کی داستان۔ قارون۔ سامری۔ علم غیب۔  
دعا و توبہ۔ لقمان۔ عالم برزخ۔ یاجوج ماجوج۔ اہل و عیال  
سومل کوثر۔ امام مہدی۔ نور محمدی اور پل صراط آتش مرود وغیرہ  
ضخامت ۴۲۴ صفحات۔ کاغذ سفید و بیز۔  
قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنے

### نگارستان

### جمالستان

### حسن کی عیاریاں

### ترغیبات حبسی یا

|                                                                                                                                                                                                                                                                     |                                                                                                                                                                                                                                                                                                  |                                                                                                                                                                                                                                                              |                                                                                                                                                                                                                                                                               |
|---------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|--------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|--------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|-------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|
| حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالا اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اسکا اندازہ اس ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں نقل کئے گئے۔ اسل ڈیشن میں متعدد افسانے ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے ادیشنوں میں نہ تھے۔ | ادب نگار کے افسانوں اور مقالہ ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان اور پاکیزگی خیال بہترین شاہکار لکھے گئے ہیں۔ بہت اجتماعی و تاریخی مسائل کا حل بھی نظر آئے گا ہر افسانہ اور ہر مقالہ نئی جگہ معجزہ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اسل ڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلا ادیشن میں نہ تھے۔ | حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشائیہ طبع کا بہترین ہتراج آپ نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعے سے آپ کو واضح ہو گا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔ | اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت نہایت شرح و بسط ساتھ معقانات تبصر کیا گیا کہ فحاشی دنیا میں کب کس کس طرح رائج ہوئی نیز کہ مذہب عالم نے اسکے علاج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں جو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے نیا ادیشن۔ |
| قیمت چار روپیہ علاوہ محصول                                                                                                                                                                                                                                          | قیمت چار روپیہ علاوہ محصول                                                                                                                                                                                                                                                                       | قیمت دو روپیہ علاوہ محصول                                                                                                                                                                                                                                    | قیمت چار روپیہ علاوہ محصول                                                                                                                                                                                                                                                    |

# مہربانی فرما کر - یہ پورا صفحہ پڑھ لیجئے

## دائیں طرف نشان (X) دیکھ لیجئے

اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا چندہ اس ماہ میں ختم ہو گیا۔ اگر آپ ہندوستان میں ہیں تو آئندہ ہر چھ ذریعہ دی، پی بھیجا جائے گا، لیکن اگر آپ پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں تو آپ اپنا چندہ چھ روپیہ (پاکستانی سکہ) ہمارے نمائندہ کو حسب ذیل پتہ سے ذریعہ منی آرڈر روانہ کر کے ہم کو اطلاع دیجئے تاکہ نگار جاری رکھا جائے۔  
ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی - ۲۲۲ - پیر الہی بخش کالونی متصل ہائی اسکول - کراچی

## پاکستان کے بہت سے خریدار

ایسے ہیں جن کا چندہ دسمبر ۱۹۵۷ء میں ختم ہو گیا تھا اس لئے سالنامہ ان کو نہیں مل سکا ہے، ان کی خدمت میں التماس ہے کہ وہ اپنا چندہ (چھ روپیہ پاکستانی سکہ) ہمارے نمائندہ کو حسب ذیل پتہ پر ذریعہ منی آرڈر بھیج کر ہم کو اطلاع دیدیں تاکہ خریداری جاری رکھی جائے اور سالنامہ سے لیکر اس وقت تک تمام ہرچے انکو بھیج دیے جائیں گے۔ آئندہ جن کا چندہ ختم ہو وہ بھی ازراہ کرم اپنا چندہ اسی پتہ پر بھیجیں۔  
ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی - ۲۲۲ - پیر الہی بخش کالونی - متصل ہائی اسکول - کراچی

## کراچی، لاہور اور راولپنڈی کے ایجنٹ صاحبان کو مطلع کیا جاتا ہے کہ

جب تک تبادلہ زر کا مسئلہ طے نہ ہوگا، نگار کے ہرچے اور ان کی طلب کی ہوئی کتابیں ان کو ہمارے نمائندوں کے ذریعہ سے پہنچیں گے۔ ازراہ کرم ان کی قیمت ادا کر کے کتابیں ان سے حسب ذیل پتہ پر وصول کر لیا کریں۔

|                                                                                 |                       |                             |
|---------------------------------------------------------------------------------|-----------------------|-----------------------------|
| نمائندہ لاہور                                                                   | نمائندہ کراچی         | نمائندہ راولپنڈی            |
| حکیم اقبال حسن صاحب                                                             | ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی | قومی کتب خانہ چوک نیا بازار |
| متصل دربار داتا گنج بخش لاہور - ۲۲۲ - پیر الہی بخش کالونی متصل ہائی اسکول کراچی |                       | راولپنڈی                    |

## پاکستان میں ہماری کتابیں حاصل کرنے کا طریقہ

پاکستانی حضرات خواہ وہ ایجنٹ ہوں یا نگار کے خریدار یا دوسرے کرمفرما ہماری کتابیں اس طرح حاصل کر سکتے ہیں کہ وہ اپنی مطلوبہ کتابوں کی فہرست ہمارے پاس بھیج دیں، ہم کتابیں ان کو ذریعہ رجسٹری بھیج دیں گے اور وہ انکی قیمت ہمارے حسب ذیل نمائندوں میں سے کسی کو دست بردست دیدیں گے یا ذریعہ منی آرڈر بھیج دیں گے۔ ۱۔ ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی - ۲۲۲ - پیر الہی بخش کالونی - متصل ہائی اسکول کراچی - ۲۔ حکیم اقبال حسن صاحب متصل دربار داتا گنج بخش لاہور - ۳۔ کتب خانہ چوک نیا بازار - راولپنڈی

# نگار کا آئندہ سالنامہ ایک مستقل کتاب ہوگی

سیکڑوں صفحات کی جس میں اس وقت کی تمام اہم مسلم حکومتوں کے سیاسی و اقتصادی مسائل پر روشنی ڈالی جائے گی اور بتایا جائے گا کہ عہد حاضر کی مسلم آبادی جو ایران سے لیکر مصر و عراق تک پھیلی ہوئی ہے کس دوسے گزر رہی ہے اور کس قدر بے چینی کے ساتھ۔

## ایک مستقبل کی تلاش

میں سرگرداں ہے

نگار کا یہ سالنامہ، تمام پچھلے سالناموں سے بالکل مختلف نوعیت کا ہوگا اور اس میں بجائے شعروادب کے زندگی کے ان مسائل پر گفتگو کی جائے گی جن کے سمجھنے پر قوموں کی موت و زندگی کا انحصار ہے۔

## یہ سالنامہ گویا وقت کی پکار ہے

اور ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس پکار کو سنے اور اس پر غور کرے۔

امید ہے کہ آپ اپنے احباب پر اس سالنامہ کی اہمیت واضح کر کے نگار کی سالانہ خریداری کی طرف ان کو متوجہ کریں گے اور خود بھی سلسلہ خریداری کو جاری رکھیں گے، اس سالنامہ کی قیمت سالانہ خریداروں سے زائد نہیں لی جائے گی، لیکن جو حضرات صرف سالنامہ لینا چاہیں گے انکو فی کاپی تین روپیہ چھ آنے معہ محصول ڈاک ادا کرنا ہوگا۔

اس سالنامہ کے ساتھ آپ کو مجموعہ استفسار و جواب کی تیسری جلد بھی نصف قیمت (ڈیڑ روپیہ) میں مل سکتی ہے۔ لیکن یہ آپ کی خوشی پر منحصر ہے۔ کوئی مجبوری نہیں ہے۔ مجموعہ استفسار کی یہ جلد ۵۰ صفحات کی مجموعہ ہے جس میں سیکڑوں مذہبی، علمی، سیاسی اور ادبی مسائل پر گفتگو کی گئی ہے۔ یہ صرف سالانہ خریداروں کے لئے ہے خواہ انکی خریداری کسی وقت سے شروع ہو۔



جن بچوں کو

بڑا ہو کر اپنے وطن کی حفاظت کرنی ہے  
ان کی پرورش نو نہال پر ہونی چاہیے

# نو نہال

نئے بچوں کو مضبوط بنانے والا  
ان کا دل پسند ٹانکٹ  
ہمدرد و اخوانہ وقفہ دہلی



Hamdani

# دی مغل لائن لمیٹڈ

(سب سے پرانی ہندوستانی جہازی کمپنی)

مغل لائن نہایت مسرت کے ساتھ اعلان کرتی ہے کہ اس سال رمضان المبارک کے بعد مندرجہ ذیل جہازات حسب ذیل تاریخوں کے لگ بھگ بمبئی سے حاجیوں کو لیکر جدہ کے لئے روانہ ہوں گے:-

## جج سرویس

|                 |         |                     |
|-----------------|---------|---------------------|
| ۲۰ جولائی ۱۹۵۰ء | ۴۰۲۶ ٹن | ایس۔ ایس۔ "محمدی"   |
| ۲۱ جولائی ۱۹۵۰ء | ۵۸۴۹ ٹن | ایس۔ ایس۔ "اسلامی"  |
| ۲۲ جولائی ۱۹۵۰ء | ۴۰۴۴ ٹن | ایس۔ ایس۔ "اکبر"    |
| ۲۵ جولائی ۱۹۵۰ء | ۳۵۶۶ ٹن | ایس۔ ایس۔ "علوی"    |
| ۱۲ اگست ۱۹۵۰ء   | ۵۴۴۸ ٹن | ایس۔ ایس۔ "رضوانی"  |
| ۱۳ اگست ۱۹۵۰ء   | ۴۰۲۴ ٹن | ایس۔ ایس۔ "مظفری"   |
| ۲۰ اگست ۱۹۵۰ء   | ۳۵۶۶ ٹن | ایس۔ ایس۔ "جہانگیر" |
| یکم ستمبر ۱۹۵۰ء | ۴۰۴۴ ٹن | ایس۔ ایس۔ "خسرو"    |
| ۴ ستمبر ۱۹۵۰ء   | ۵۴۴۸ ٹن | ایس۔ ایس۔ "رضوانی"  |
| ۶ ستمبر ۱۹۵۰ء   | ۴۰۲۶ ٹن | ایس۔ ایس۔ "محمدی"   |

برادری کی ٹھیک ٹھیک تاریخوں اور جدہ سے واپسی کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔

جہاز کا کرایہ (معہ خوراک)

بمبئی / جدہ واپسی

۱۱۰۵/- روپے

درجہ اول

۳۹۸/- روپے

عرشہ (ڈیک)

ان کرایوں میں قرطبہ، کامران، حفظان صحت جدہ کے محاصل اور کشتی کا کرایہ شامل نہیں، جن کی مجموعی رقم ۴ روپے ۱۲ آنے ہوتی ہے۔

## نشستیں محفوظ کرائیے

عازمین حج کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ اولین فرصت میں بن بہازوں کے لئے اپنی نشستیں محفوظ کرائیں، تاکہ بعد میں سعادت حج سے محروم نہ ہوں۔

درخواست کے ساتھ مندرجہ ذیل امور کی وضاحت ضروری ہے:-

(۱) ہر ایک عازم حج کا پورا نام - (۲) والد یا شہسوار کا نام - (۳) جنسیت یعنی مرد یا عورت - (۴) عمر - (۵) پورا پتہ، خوش خط،

(۶) کس درجہ کا ٹکٹ درکار ہے؟ - (۷) کن تاریخوں میں سفر کا ارادہ ہے؟ - اگر ساتھ میں بچے ہوں تو ان کا نام وغیرہ درج کرنا بھی

نہایت ضروری ہے، خواہ وہ شیر خواہ ہی کیوں نہ ہوں۔

درخواست بھیجنے کا پتہ:-

ٹرینر مار ایس اینڈ کمپنی لمیٹڈ

تارکاپتہ

مینجنگ ایجنٹس

دی مغل لائن لمیٹڈ

۱۶، بنک اسٹریٹ، بمبئی

MOGUL

BOMBAY.

## اب بھی وقت ہے

کہ آپ ”من ویزواں“ کے دونوں حصے  
تیرہ روپیہ میں معہ محصول حاصل کر سکیں گے۔  
ورنہ

غالباً دو ماہ کے بعد آپ کو یہ کتاب کسی قیمت پر نہ مل سکے۔  
کیونکہ اب صرف ۱۰۰ نسخے اس کے باقی رہ گئے ہیں اور آئندہ  
اتنی بڑی کتاب کا چھپنا آسان نہیں ہے۔

”من ویزواں“

ایک صحیفہ انسانیت ہے جس کے مطالعہ کے بغیر آپ غریب کی  
صحیح روح نہیں سمجھ سکتے۔ منیجر نگار لکھنؤ

## رعایتی قیمت

”مجموعہ تفسار و جواب“ کی تیسری جلد

ضخامت ۱۰۰ صفحات

قیمت علاوہ محصول تین روپیہ  
آپ کو علاوہ محصول صرف ڈیڑھ روپیہ میں مل سکتی ہے۔  
اگر آپ ”نگار“ کی سالانہ خریداری جاری رکھیں یا نئی  
خریداری منظور فرمائیں۔

جو حضرات فی الحال خریداری میں وہ بھی اس

رعایت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔  
منیجر نگار لکھنؤ

جس  
صاف کرنے  
اور  
تولید رتی  
بڑھانے  
کیلئے



استعمال کیجئے

قیمت فی شیشی صرف ایک روپیہ ہر جگہ ملتی ہے  
ہمدرد و اخانہ وقف دہلی



اور اسی لئے اس کی طرف سے جو اعلانات شایع ہوئے وہ اس احساس سے خالی نہ تھے اور اس نے بھارت کی حکومت کے ان صلاح جو یا نہ اعلانات کے جواب میں جو کچھ جس لب و لہجہ کہا وہ یقیناً قریب و دور اندیشی اور تدبیر و مصلحت دونوں کے خلاف تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ دور تذبذب عرصہ تک قائم نہ رہ سکتا تھا اس کو دور ہونا تھا یا زیادہ سنگین، لیکن برصغیر سے اسی دوران میں حیدر آباد کا مسئلہ، کشمیر کی نزاع، تخیلیہ کشندگان کی جاہلاد کا جھگڑا، تبادلہ زر کا تعطل، تجارتی و اقتصادی ڈھول اور انھیں سے پیدا ہونے والے بہت سے چھوٹے چھوٹے مسائل ایسے پیش آتے رہے کہ باہمی تعلقات اور زیادہ خراب ہی ہوتے گئے، اتفاق سے اسی کے ساتھ اقتصادی بے چینی کی وجہ سے کمیونسٹ تحریک کو زیادہ پھیلنے کا موقع مل گیا اور خصوصیت کے تحت بنگال میں اس نے زیادہ تشویشناک صورت اختیار کر لی اور مغربی بنگال کی حکومت کو اس کے خلاف سخت قدم اٹھانا پڑا اس کا اثر مشرقی بنگال پر بھی پڑتا تھا، چنانچہ وہاں بھی کھلنا میں کمیونسٹوں نے سر اٹھایا اور حکومت پاکستان کو ان کے خلاف فوج اور پولیس سے کام لینا پڑا۔ یہ کارروائی بالکل ایسی ہی تھی جیسی کمیونسٹوں کے خلاف مغربی بنگال میں ہو رہی تھی لیکن بھارت کی مہاسبھائی جٹ نے جو ہمیشہ کسی نہ کسی بہانہ کی تلاش میں رہتی ہے، کھلنا کے واقعہ کو طبقاتی رنگ دیکر ہندو مسلم سوال بنا دیا اور مغربی بنگال کے ہندوؤں کو مشتعل کر کے مسلمانوں پر مظالم شروع کر دئے ظاہر ہے کہ اس کا اثر مشرقی بنگال پر بھی پڑتا تھا۔ وہاں کے ہندوؤں پر بھی مسلمانوں نے زیادتی شروع کر دی اور آخر کار اس جذبہ انتقام نے دونوں طرف اتنی خطرناک صورت اختیار کر لی کہ اس کا اثر بنگال کے علاوہ دوسرے صوبوں تک بھی پہنچا اور ان حالات نے پاکستان و بھارت کے تعلقات کو اس درجہ خراب کر دیا کہ جنگ کے سوا کوئی دوسری صورت باقی نہ رہ گئی تھی۔ بھارت کی حکومت کے لئے یہ بڑا نازک وقت تھا اور معلوم ایسا ہوتا تھا کہ اگر حکومت نے جنگ کا فیصلہ نہ کیا تو اسے استعفا دینا پڑے گا، کیونکہ پنڈت جواہر لال اور ان کے دو تین ساتھیوں کے سوا بھی مہاسبھائی ذہنیت کے تھے۔

اس میں شک نہیں اگر جواہر لال کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو وہ اس دباؤ سے متاثر ہو کر اسی غوغا میں شریک ہو جاتا یا استعفا دیدیتا، لیکن چونکہ ان کے دل میں ملک و قوم کا صحیح درد پایا جاتا ہے اور وہ جانتے ہیں کہ بھارت پاکستان کی جنگ کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے، اس لئے انھوں نے محسوس کیا کہ ملک کی صحیح خدمت کا وقت یہی ہے اور انھوں نے نوابزادہ لیاقت علی خاں کو کھلا بھیجا کہ اگر بھارت و پاکستان کی قسمت میں یہی لکھا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے لڑ کر تباہ ہو جائیں، تو بھی کیا خرچ ہے، آئیے آخری بار ایک دوسرے سے گلے تو مل لیں۔

پاکستان نے ہندوؤں پر مظالم کئے ہوں یا نہ کئے ہوں، لیکن یہ یقینی ہے کہ اس وقت وہاں کی اقلیت بھی بالکل اسی طرح غیر مطمئن تھی جس طرح بھارت کی اور وہاں بھی انتقام جو یا نہ جذبہ سے کام لیا جا رہا تھا، پھر چونکہ پاکستان پنڈت نہرو کی اس تجویز کو پہلے ٹال چکا تھا کہ ایک دوسرے کے خلاف جنگ نہ کرنے کی پالیسی کو باہمی معاہدہ کی صورت دیدیجائے، اس لئے پنڈت نہرو نے نوابزادہ لیاقت علی خاں کو مل بیٹھ کر باتیں کرنے کی دعوت تو دیدی لیکن خود انھیں

بھی زیادہ امید کامیابی کی نہ تھی۔

پنڈت نہرو کی اس دعوت کے بعد جتنی گھڑیاں نوابزادہ کے جواب کے انتظار میں گزریں وہ بہت عجیب و غریب گھڑیاں تھیں، اور کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ اگر پاکستان نے بھارت کی اس آخری سعی امن و صلح کو بھی رو کر دیا تو کیا ہوگا، لیکن شکر ہے کہ یہ حالت منظرہ عرصہ تک باقی نہیں رہی اور نوابزادہ نے اس دعوت کو قبول کر کے مایوسیوں کو امید میں بدل دیا۔

پاکستان نے کیوں ایسا کیا اس کے اسباب سیاسی ہوں یا اقتصادی ہمیں ان پر غور کرنے کی ضرورت نہیں، ہم تو یہی کہتے ہیں کہ ضمیر انسانی جاگا اور خدا نے انکے دل میں نیکی ڈال دی۔

نوابزادہ نے کامل ایک ہفتہ دہلی میں بسر کیا اور بھارت و پاکستان تعلقات کے باب میں کوئی پہلو ایسا نہیں تھا جس پر تفصیلی یا اجمالی گفتگو نہ ہوئی ہو، لیکن چونکہ بنیادی مسئلہ اقلیت و اکثریت کے تعلقات کا تھا اس لئے اسی پر زیادہ زور دیا گیا اور آخر کار آپس میں ایک معاہدہ ہو گیا کہ دونوں ملک اپنی اپنی اقلیت کے تحفظ و اطمینان کے لئے ہر ممکن صورت اختیار کریں گے۔ اس معاہدہ کی تفصیلات چونکہ سب کو معلوم ہیں اس لئے ان کے اظہار کی ضرورت نہیں، لیکن اب کہ اس معاہدہ کو دو مہینے کے قریب ہو چکے ہیں، ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ اس پر عمل ہوا یا نہیں اور اس کے آئندہ نتائج کے متعلق کیا حکم لگایا جاسکتا ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ دونوں ملکوں کی اقلیت نہیں بلکہ اکثریت پر کیا اثر ہوا، کیونکہ اصل چیز اکثریت ہی کی ذہنیت کو بدلنا ہے جس کے بغیر حکومت کامیاب نہیں ہو سکتی۔

جس حد تک حکومتوں کا تعلق ہے یقیناً دونوں جگہ انتہائی نیک نیتی سے کام لیا جا رہا ہے، لیکن جس حد تک ملک کی آبادی کا تعلق ہے، ہم کو ماننا پڑے گا کہ اس کا اثر پاکستان میں بہ نسبت بھارت کے زیادہ خوشگوار ہوا ہے۔ اور جس کا سب سے بڑا ثبوت مسلمانوں کا وہ جوش و خروش تھا جو انھوں نے پنڈت نہرو کے کراچی پہونچنے پر ظاہر کیا۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ مسلمان اپنے کیرکٹر کے لحاظ سے بہت صاف دل واقع ہوا ہے اور اپنے جذبات کے اظہار میں ہمیشہ انتہا پسندی سے کام لیتا ہے، برخلاف اس کے ہندو قوم تجارت پیشہ ہونے کے لحاظ سے ہر چیز کو جانچنے، تولنے، پرکھنے کی عادی ہے، دو ٹوک بات کبھی نہیں کرتی اور اخیر تک تذبذب کی کیفیت اس پر طاری رہتی ہے، چنانچہ نہرو لیاقت پیکٹ کے باب میں بھی بھارت کی ہندو پبلک میں یہی ذہنیت کام کر رہی ہے اور اس کو اعتبار نہیں آتا کہ نوابزادہ نے جو کچھ کہا ہے اس پر پاکستان واقعی عمل کرے گا، علاوہ اس کے یہاں کی اکثریت یوں بھی نہرو لیاقت معاہدہ کو پسند نہیں کرتی اور وہ جنگ کر کے پاکستان کو بھارت ہی میں شامل کر لینا چاہتی ہے۔ برخلاف اس کے پاکستان میں کوئی جماعت ایسی نہیں ہے جو ہندوستان سے

جنگ کر کے اس کو فتح کر لینے کا خیال دل میں لاسکتی ہو، اس لئے قدرِ ثاؤدلی پکیٹ کا اثر پاکستان کی اکثریت پر بہ نسبت ہندوستان کی اکثریت کے بہتر ہونا چاہئے تھا اور ہوا۔

اس معاہدہ کی شرائط پر عمل کرنے کے لئے اس وقت تک بھارت و پاکستان دونوں ملکوں میں جو صورتیں اختیار کی جا رہی ہیں وہ بہت امید افزا ہیں، یہاں تک کہ کمرِ جی ایسے سخت مہا سبھائی ذہنیت رکھنے والے انسان کو بھی دہلی زبان سے اس کا اعتراف کرنا پڑا۔ ہندو مسلمانوں کی ہجرت بھی کم ہو رہی ہے، بعض تارکین وطن اپنے اپنے گھر واپس بھی آ رہے ہیں، دونوں ملکوں کے اخباروں کا لب و لہجہ بھی دوستانہ ہو گیا ہے، تجارتی گتھیوں کو بھی سلجھایا جا رہا ہے، خیرگالی مشن بھی ادھر سے ادھر آ جا رہے ہیں، لیکن اصل سوال ملک کی ذہنیت بدلنے کا ہے، اور وہ اس قدر جلد ممکن نہیں۔

پنڈت نہرو نے خود بھی یہی ظاہر کیا تھا کہ یہ پکیٹ کوئی معجزہ نہیں ہے جو فوراً لوگوں کی کایا پٹ دے بلکہ ایک ایسی تعمیر کی بنیاد ہے کہ اگر اسے صحیح اصول پر استوار کیا گیا تو کھوئی ہوئی انسانیت بھارت و پاکستان دونوں جگہ پھر ہاتھ آ سکتی ہے۔ اس لئے اب دیکھنا صرف یہ ہے کہ وہ صحیح اصول کیا ہیں؟

پکیٹ سے پہلے صرف دو ہی صورتیں جھگڑا طے کرنے کی نظر آتی تھیں۔ لڑائی یا مکمل تبادلہ آبادی اور پکیٹ نے یہ طے کر دیا ہے کہ ان میں سے کوئی صورت قابل عمل نہیں ہے، اس لئے دونوں ملکوں کے تعلقات کو خوشگوار بنانے کے لئے اس کے سوا کوئی صورت ممکن نہیں کہ دونوں جگہ اقلیت کو مطمئن کیا جائے، حکومت کی طرف سے نہیں بلکہ اکثریت کی طرف سے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس میں بہ نسبت ہندوستان کے پاکستان جلد کامیاب ہو سکتا ہے، کیونکہ اول تو وہاں سوال ۶ کروڑ کی اکثریت کا ہے، اور بھارت میں ۲۵ کروڑ کا، علاوہ اس کے وہاں کوئی پارٹی ایسی نہیں ہے جو حکومت کے فیصلہ کی مخالفت کرے اور یہاں مہا سبھائی اور راشٹریہ سیم سنگھ دونہا ہی زبردست جماعتیں حکومت کی راہ میں حایل ہیں۔ اس لئے میری رائے میں پاکستان کو یہ نہ دیکھنا چاہئے کہ بھارت میں اس پکیٹ پر کس حد تک عمل ہوتا ہے، بلکہ اس کو صرف دیکھنا چاہئے کہ جو معاہدہ اس نے کیا ہے اس کا پورا کرنا اسلامی و انسانی فرض ہے خواہ بھارت اس پر عمل کرے یا نہ کرے اور اگر پاکستان نے اپنے طرز عمل سے اپنے یہاں کی اقلیت کو ہر طرح سے مطمئن کر دیا تو اس کا اثر یہاں کی اکثریت پر بھی ضرور پڑے گا اور رفتہ رفتہ اس کی ذہنیت بدل جائے گی۔

اس پکیٹ کو زیادہ کامیاب بنانے کے لئے چند اور باتیں بھی ہیں جن پر بھارت و پاکستان دونوں حکومتوں کو جلد متوجہ ہونا چاہئے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ امرتسر اور لاہور کے درمیان ریل کا سلسلہ بھر جا رہی ہو جانا چاہئے، تاکہ لوگ آسانی کے ساتھ ادھر ادھر جا سکیں اور حالات کا مطالعہ کر کے خود کسی نتیجہ تک پہنچ سکیں۔ دوسری چیز پرمٹ کا حصول ہے، اس میں بھی زیادہ آسانیاں پیدا کرنا چاہئے، تیسری چیز جس پر بہت جلد توجہ کی ضرورت ہے، شرح تبادلہ کا فیصلہ ہے، اس کے طے نہ ہونے سے دونوں طرف تجارتی تھقل پیدا ہو گیا ہے اور اقتصادی نقطہ نظر سے اس کا اثر بہت خراب پڑ رہا ہے، ہمیں امید ہے کہ نوابزادہ کی واپسی امریکہ اور پنڈت نہرو کی واپسی انڈونیشیا کے بعد ان دونوں کی ملاقات میں یہ مسائل بھی طے ہو جائیں گے اور نقصان میں زیادہ خوشگوار تبدیلی محسوس کی جائے گی۔

## خطوط نگاری

خط لکھنا ایک فن ہے۔ اچھی زندگی بسر کرنا بھی ایک فن ہے لیکن اس فن میں کمال حاصل کرنے کیلئے کسی کوشش کی ضرورت نہیں۔ فنون لطیفہ میں کمال حاصل کرنے کے لئے دنیا میں کچھ اصول ہیں، کچھ ضابطے ہیں لیکن محبت کرنے کے لئے نہ علم سینہ درکار ہے نہ علم سفینہ۔ اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ خط لکھنے کے لئے صرف قلم اور کاغذ کی ضرورت ہے تو نہ خط لکھنے پر حرج آتا ہے اور نہ خط لکھنے والوں پر۔ کاغذ اور قلم ہی تو نہیں ان میں غنچہ بھی شامل ہے۔ جہاں دل کی نسبت ہو وہاں بے اصولی بھی ایک اصول بن جاتی ہے۔ لغزشیں حسین ہو جاتی ہیں۔ لکنت میں قص پیدا ہو جاتا ہے۔ ستارے چاند اور سورج خود بننے، سنورتے اور غروب ہو جاتے ہیں۔

رزمیہ تصنیف کرنے کے لئے موکھوں کو قابو میں لانا ضروری ہے۔ نظم لکھنے کے لئے جذبہ خیال اور موسیقی کی مفاہیت درکار ہے۔ ناول میں زمین کی حرکت اور زمین کی پرچھائیوں کو سمونا پڑتا ہے، گویا ان ادبی کارناموں میں ہم وجود سے کام لیتے ہیں اور ایک نئے وجود کی تخلیق کرتے ہیں۔ دنیا کو خیال کی گرفت میں لا کر نیا رنگ اور نیا آہنگ بخش دیتے ہیں لیکن عدم سے وجود میں لانے کا کام نہیں کواں میں بدل ڈالنا، کچھ نہیں سے کچھ تو ہے کا مجرہ دکھانا خطوط نگار کا کمال ہے۔ ذہن میں کوئی خیال ہو یا نہ ہو خط لکھا جاسکتا ہے۔ جس طرح بات چیت کے لئے کسی موضوع کی ضرورت نہیں اور گفتگو میں کسی موضوع کا نہ ہونا اس کے ہونے سے زیادہ دلچسپ ہوتا ہے۔ اسی طرح خط میں نہ اصول کی ضرورت نہ خیال کی ضرورت نہ موضوع کی ضرورت۔ زندگی اپنی راہیں خود بنا لیتی ہے، خط اپنی باتیں خود پیدا کر لیتا ہے۔ زندگی کے آئینہ کا پتہ نہ انجام کی خبر البتہ ایک مہاؤ ہے، ایک روانی ہے، ایک آپکے ہے۔ خط میں ابتدائے انتہا، وسطانہ تکمیل، تشبیب نہ دعائیں پس گریز ہی گریز ہے اور ہزاروں سال کے تجربے نے ہمیں جو کچھ بتایا ہے یہ ہے کہ گریز ہی میں زندگی کا حسن ہے کیونکہ زندگی خود ایک گریز ہے۔

زندہ رہنے کے لئے اور خط لکھنے کے لئے زندگی کا احترام ضروری ہے۔ زندگی سے میری مراد ہے اونچی نیچی سڑکیں، چھوٹی بڑی دکانیں، جلیٹھ کی دھوپ، برسات کی اندھیری بھیاٹک اور مچل جانے والی راتیں، قہوہ خانے، گلابی جاڑوں میں نظریں بچا کر مسکرانے والے پھول، جواہری، پی کر گلاس چورچور کر دینے والے شرابی۔ فضا میں خوشبو میں بکھرنے والے دوپٹے، مرجھائے ہوئے معصوم چہرے، پرائی چیزوں کا نیا پن، سادگی میں بناوٹ، ٹیکوں میں چھپی ہوئی

ہوتی کمزوریاں، پندار کی تہ میں انکسار، آلفا اور اوڈل، علم الکلام اور سنگرمشین۔

زندگی میں کھوجانا، زندگی پر قابو پالینا اور زندگی کو معاف کر دینا، تین باتیں نہیں ایک بات ہیں۔ جو شخص اس حسین آگ سے گزر چکا ہو اسے حق ہے کہ وہ اپنی سوانح عمری اپنے قلم سے لکھے۔ وہ سوانح عمری قل هو اللہ کی تفسیر میں ہو یا خطوں میں۔ البتہ یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ خطوں میں قل هو اللہ کی تفسیر نہیں ہوتی۔ خط حسن اتفاق کا نام ہے اور حسن اتفاق ہی سے یہ ادب کی ایک صنف ہے۔ اچھے خط ادبی کارنامہ ہوتے ہیں اور ان کے لکھنے کے لئے ادبی فیل پا کے مرض میں مبتلا ہونا کوئی اچھی بات نہیں۔ خط چھوٹی چھوٹی باتوں سے بنے جاتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں ہی میں دنیا کا لطف ہے۔ زندگی میں لمحے قیمتی ہوتے ہیں۔ ان لمحوں کو زندگی کے دامن سے

چُرالینا، محفوظ رکھنا اور راز داروں میں تقسیم کرنا، یہی صن عمل ہے، یہی تخلیق ہے اور یہی نجات ہے۔ ہاں تو وہ خطوط جن میں استدلال کا زور ہو، فلسفہ پر باقاعدہ بحثیں ہوں، بالارادہ فنکاری ہو، خطوط نہیں ہوتے۔ خطوں میں مرزا بیدل کے اشعار کی گنجائش ہے لیکن ان کی ماورائیت پر مدلل بحث کی گنجائش نہیں۔ آپ خطوں میں رو سکتے ہیں اور قہقہے لگا سکتے ہیں لیکن اخلاقاً، مصلحتاً اور قانوناً شوہنہار کی قنوطیت پر وعظ کہنے کی اجازت ہے اور نہ قہقہوں پر مضمون لکھنے کا موقع آپ کو حاصل ہے۔ دنیا کے سارے خط ایک فقرے سے شروع ہوتے ہیں اور ایک فقرے پر ختم ہو جاتے ہیں۔ وہ فقرہ بہت مختصر بھی ہے اور بیکنار بھی ہے ”ہم اور تم انسان ہیں“ اس ایک فقرے میں انسانیت بھی ہے اور خط لکھنے کے اصول بھی ہیں۔ مفہوم بھی یہی ہے، ساز و سامان بھی یہی ہے اور نشانہ بھی یہی ہے۔

ناول یا افسانہ لکھتے وقت فنکار کے ذہن میں قارئین ہوتے ہیں۔ خط لکھتے وقت دماغ میں نہ کوئی غول یا بانی ہوتا ہے نہ کوئی محفل۔ ایک باتیں کرنے والا ہوتا ہے ایک باتیں سننے والا۔ اس عمل میں صرف دو انسانوں کی خودی بیدار ہوتی ہو صرف دو انسان زندہ ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ ساری دنیا غنودگی کے عالم میں ہوتی ہے۔ کس کی محفل کو دیکھیں، ہم تم ہیں خود ایک محفل۔ بس اس معصوم گناہ میں خطوں کی کامیابی کا راز مضمر ہے اور یہی وجہ ہے کہ انسان کے وہ سبک، دلکش اور نازک پہلو جو اس کے بلند ادبی کارناموں میں ظاہر نہیں ہوتے خطوں میں نمایاں ہو جاتے ہیں خطوں میں ہمارے لئے وہی کشش ہوتی ہے جو ہمارے لئے ہمارے دوستوں میں ہوتی ہے۔ یہ بات غلط ہے کہ انسان کی سب سے بڑی خواہش خود کو نمایاں کرنا، ظاہر کرنا یا منظر عام پر لانا ہے۔ انسان کی سب سے بڑی خواہش دراصل اپنے آپ کو چھپانا ہے۔ جس طرح فن کی خوبی فن کے چھپانے میں ہے اسی طرح انسان کا کمال خود کو چھپانے میں ہے ریاضی کے مسئلے، ایمان کی نفاستیں، افسانوں کی پرچھائیاں، یہ سب پردے ہیں اس لئے اگر آپ اپنے ہمسایہ کی سرگوشیاں سننا چاہتے ہیں اسے برہنہ دیکھ کر قہقہہ لگانے کا جذبہ آپ کے دل میں ہو تو ادبی کارناموں کے بجائے اس کے خطوں کا روحانی سفر کیجئے۔ یہ نسخہ سہل ہے۔ خطوں میں آپ حکومتوں کا زوال دیکھیں گے۔

ان میں بیمار بعض اوقات تندرست معلوم ہوں گے۔ غم پسند خوش نظر آئیں گے جنہیں آپ مغرور سمجھتے ہیں انہیں انسان دوست پائیں گے۔ جنہوں نے میدان سرکے ہیں ان میں گہری انسانیت ملے گی۔ خاک کے تودوں میں جذبہ پائے گا۔ مردم بیزاروں میں نرمی، نزاکت اور خلوص کی آغے ہوگی۔ گلاب کے تنخے مصنوعی معلوم ہوں گے اور بید مجنوں پر بہار نظر آئے گی اور کہیں کہیں وہی پائے گا جو جانتے ہیں، جو دیکھا ہے، جو سنا ہے۔ جن خطوں میں انسان نے اپنے اوپر قابو پالیا ہو، جہاں وہ خود ہو، جہاں آپ اس کے راز داں بن سکیں، وہ آپ کے دوست معلوم ہوں۔ جہاں آپ اسکے گدگدیاں کریں اور وہ مچل جائے وہیں فتح ہے، وہ خط ادبی کارنامہ ہے جس کی بدولت لکھنے والا ان چند لمحوں کی طرح لازوال ہو جائے، جنہیں جنبش قلم نے محفوظ کر لیا ہے۔

خطوں کو نجی ہونا چاہئے۔ نجی باتوں میں رنگارنگی، دلچسپی تنوع اور عمومیت پیدا کرنا اچھے مکتوب نگار کا کام ہے۔ یہ ساری خوبیاں خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں۔ شرط یہ ہے کہ وہ دیکھے اور محسوس کرے۔ دیکھنے اور محسوس کرنے ہی سے اسلوب بنتا ہے۔ دیکھنے اور محسوس کرنے ہی میں وہ بصیرت ہوتی ہے جو جزو کوکل سے زیادہ حسین بنا دیتی ہے۔ ایک ایسے شخص کو جو ہر بار دیکھتا ہے اور ہر بار سمجھتا ہے یہ شورہ دینے کی ضرورت نہیں کہ اپنی بات میں پرانی بات بھی شامل ہونی چاہئے۔ عورت کی محبت سے زیادہ نجی اور بات کیا ہوگی، لیکن اگر یہ بات سچ ہے کہ نظر سے خاک کیمیا ہو جاتی ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ ایک اچھا مکتوب نگار ان نجی باتوں میں وہ رنگ بھر دیتا ہے کہ وہ ہمیں اپنی ہی داستان معلوم ہونے لگتی ہیں۔

یہ نجی باتیں اس لئے غیر معمولی ہیں کہ وہ عام انسانوں کو مخصوص کر دیتی ہیں، جس طرح ایک نظم اپنے مخصوص لب و لہجہ، مخصوص بحر اور مخصوص الفاظ کی بدولت ممتاز تجربہ سمجھی جاتی ہے اسی طرح انسان خاص خاص حقائق، انوکھی دلچسپیوں اور غیر شعوری حرکتوں سے ممتاز ہوتا ہے اور دوسروں سے ممیز کیا جاسکتا ہے۔ رنگ ہیشما نہیں ہیں۔ ان رنگوں کی آمیزش میں ستم ظریفی ہے۔ اس لئے دنیا ایک بھی ہے اور بوقلمون بھی ہے۔ خطوں میں رسمی نیکیوں کا خیال ہوتا ہے نہ کمزوریوں سے ڈر لگتا ہے۔ ان کی فضا میں ایک قسم کی پرسکون "انارکی" ہوتی ہے۔ اس لئے مکتوب نگار نادان بچوں کی طرح نہ صرف اپنے اوپر اعتماد رکھتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی اعتماد کے لائق سمجھتا ہے وہ اپنے مخصوص لب و لہجہ میں بات کرتا ہے اور اپنی حقائق سے اس طرح لطف اٹھاتا ہے جیسے پُرانا شرابی پیالہ کو لبوں سے چھو کر راز دارانہ انداز میں چسکیاں لے رہا ہو۔ یہ ہلکے اور گہرے رنگ، اونچی نیچی سانسیں، انسانی جذبات کا بے لاگ اظہار جیسے تیرکمان سے نکل جائے۔ انہی سروں کے نت نئے ملاپ سے شخص شخصی ہو جاتا ہے۔ یہ معمولی باتیں تصویر میں حرکت پیدا کر دیتی ہیں۔ خط و خال کی باریکیاں اُجاگر ہو جاتی ہیں۔ ہم ایک نظر میں بتا سکتے ہیں یہ سوکھٹا ہے، یہ چارلس لمب ہے، یہ شیلی ہیں، یہ مہر سی ہیں۔ جو ہم سے دور ہونے کے باوجود ہمارے تصور میں جوان

ہیں۔ یہ حالتیں ہیں جو بڑھے پیدا ہوئے تھے اور جنہوں نے زندگی میں کبھی جوانی کی تمنا بھی نہیں کی۔ یہ غالب ہیں جو چاری کزوریوں سے محبت کر سکتے ہیں اور اپنی نیکیوں پر بے محابا تہقہہ لگا سکتے ہیں اور یہ کہیں ہے جس کی ادائیں چھڑے دیگر معلوم ہوتی ہیں۔۔۔۔۔ ایسے اچھے اچھے مکاتیب بے ارادہ لکھے جاتے ہیں یہاں وجہ ہے کہ بہت کم ادبی شخصیتیں خطوط لکھنے میں کامیاب ہوتی ہیں۔

مکتوب نگاری کی ابتدا سلطنت روم کے سایہ میں ہوئی، ممکن ہے قدیم تہذیب کے دوسرے مرکزدوں میں بھی اس نے کچھ فروغ پایا ہو لیکن یہ ثابت نہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ یونان میں یہ شغل نہ عوام میں محبوب ہوا اور نہ خواص میں، شاید اس لئے کہ ان کی شہری ریاستیں سیاسی اور جغرافیائی حالات کی بنا پر سیاروں میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ ہر ریاست ایک دنیا تھی۔ معاشرت محدود تھی۔ ہتکدوں میں ورزش کے میدانوں میں، دوستوں کی محفلوں میں لوگ ایک دوسرے سے مل سکتے تھے، دل کے غبار اور سر کے خمار کے لئے راہیں تھیں۔ اپنے سیارہ کے علاوہ دوسروں کا وجود عدم ان کے لئے برابر تھا۔ وہاں کے بنے والوں سے انہیں اتنی ہی دلچسپی تھی یا ہو سکتی تھی جتنی ہمیں فرشتوں سے ہے یا ہو سکتی ہے۔ فرشتوں سے دوستی کے امکانات کم ہیں اور بغرض محال یہ تعلق پیدا بھی ہو جائے تو کیا معلوم وہ ہماری بات سمجھنے کی زحمت گوارا بھی کریں گے یا نہیں۔ اور پھر یہ اندیشہ کیا کم ہے کہ فرشتے مسکراتے ہیں۔ یہی حال ان یونانیوں کا تھا جن کے لئے ان کی چھوٹی سی ریاست ایک ایسے محفوظ خول کی مانند تھی جہاں تسکین کے تمام سامان موجود ہوں۔ اسی باعث یونان میں مکتوب نگاری کی روایت نہیں ملتی۔ اس روایت کے نشوونما کے لئے شرط ہے وسیع معاشرت، باقاعدہ حکومت، زیادہ سے زیادہ لوگوں کے جاننے کے مواقع، عملی زندگی سے واقفیت، ایک ایسی زبان جو دور و نزدیک بولی اور سمجھی جاتی ہو جس میں ادبی صلاحیتیں ہوں یہ شرائط پہلی بار رومی معاشرت میں پورے ہوئے۔

روم کی عملی زندگی کی جھلکیاں اور اس کی معاشرت کی پرچھائیاں دیکھنی ہوں تو سسرو کے مکاتیب میں دیکھئے۔ آپ ان میں سادگی کی تلاش کریں گے تو خالی ہاتھ واپس آئیں گے۔ رومیوں کے مکاتیب، خطابت اور روزمرہ کی بول چال کے بین بین ہیں۔ اس دور میں فن خطابت کے اصول اور بلاغت کے قواعد خواص کی ذہنی تربیت کی پہلی منزل تھے۔ زندگی بندھے ملے قوانین کی پابند تھی۔ اس لئے مکتوب نگاری کے فن کو بھی اسی نہج پر مرتب کیا گیا تھا۔ خطوط کی قسمیں: مبارکباد کے خطوط، تنبیہی خطوط، تعزیت کے خطوط، ناصحانہ خطوط، وہ خطوط جس میں کسی پر ملامت کی جائے اور وہ خطوط جن میں دوسروں کو تشفی دی جائے۔ ان کے علاوہ فرماں اور رقعے تھے اور ان سب کے آداب و القاب مضامین، ابتدا اور انتہا کے اسالیب مقرر تھے۔ القاب آداب کے بعد غرض دیکھئے اب یہ پانی چلا کے انداز پر گفتگو شروع ہوتی تھی جس میں بلاغت کے سارے زیورات

صرف کر دئے جاتے تھے۔

انگریزی زبان میں، پندرھویں صدی میں مکاتیب لکھنے کا آغاز ہوا، یا یوں کہئے کہ انگلستان میں اس صدی سے قبل جو مکاتیب لکھے گئے وہ لکھنے والوں کے ساتھ ہی دفن ہو گئے۔ پندرھویں اور سولہویں صدی کے مکاتیب بیشتر رقعات کی صورت میں ہیں جن میں الفاظ کا بہوم قیامت سے کم نہیں۔ نشاۃ الثانیہ کے آغاز میں اس فن کے بہت سے امام موجود تھے لیکن یا تو ان کے خطوط ”پس یاد کروہجے اور معنی“ قسم کی مشقیں ہیں یا ”ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا“ قسم کے دغظ ہیں۔ ہر ورق سے کفن اور کافور کی بو آتی ہے۔ نجی خطوط میں سوائے نجی باتوں کے سب کچھ لکھا جاتا ہے۔ ان میں ابدی حقایق کے چہرے سے اس بیدردی کے ساتھ نقاب اٹھایا گیا ہے کہ خطوں کی روح پرواز کر گئی ہے۔ یہ خطوط نمونے کے خطوط ہیں۔

سترھویں صدی میں پُرانے اطالوی مکاتیب کے ترجمے کئے گئے لیکن ان سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا جیمز ہول جسے انگلستان میں مکتوب نگاری کا باوا آدم سمجھا جاتا ہے اسی دور کا آدمی ہے لیکن اس کے خطوط میں بھی وہی کاریگری اور ادبی نفاستیں ملتی ہیں۔ جان ہیزنگ ٹن جو ملکہ کے درباریوں میں سے تھا ایک حد تک سادہ اور بے تکلف ہے اس نے اس کے خطوں میں بلاغت کی چاشنی کم ہے اور زندگی کی گرمی نسبتاً زیادہ ہے۔ اس قدر طویل مایوسی کے بعد ہماری ملاقات ایک شاعر سے ہوتی ہے جو ایک اچھے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ دو بار دیوانہ ہو چکا ہے، تنہائی پسند ہے۔ اپنے بارغ میں پھولوں کی دیکھ بھال کرنا، گنگنا نا اور خط لکھنا اس کی زندگی کے مشاغل ہیں، خوبی ہے کہ گھر کی چھٹی چھوٹی باتیں اس کے قلم سے نکل کر گیت بن جاتی ہیں۔ اٹھارھویں صدی کے اس ادیب کا نام ”ولیم گوسپ“ ہے۔ اس زمانہ میں دو اور مکتوب نگار ہوئے ہیں، ایک مشہور شاعر گرتے جس کی زندگی کا بیشتر حصہ کیمبرج یونیورسٹی کی منزلوں میں گزرا اور جس کے کردار کا سب سے نمایاں پہلو اس کی فطری جھجک تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کو انسانوں سے محبت ہوتی ہو لیکن اپنے خاص مذاق کے باعث خواص کے دائرے سے باہر نہیں جاسکتے اور عوام انہیں اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو شاید اصولی طور پر انسانیت کے تصور سے محبت کرتے ہیں۔ لیکن افراد سے شیر و شکر ہونا ان کے لئے بیزخ میں پہنچ جانے سے کم نہیں ہوتا۔ گرتے کے مکاتیب مخصوص دوستوں کے نام ہیں جن میں اس کی طبعی نفاست، ادبی ذوق اور گہری انسانیت اس طرح جھلکتی ہے:- ”سرخ بدن کی جھلکے جیسے بدن کی تہ میں“۔ ان دو شاعروں کے علاوہ جن کی شہرت اُس وقت تک قائم رہے گی جب تک دارالعوام کا دستور باقی ہے۔ ایک خاتون ہیں میری، ارنسٹ ہانٹیک جنہوں نے اپنی بیٹی کے نام دلچسپ خطوط لکھے ہیں۔ ان خطوں میں بچوں کی تربیت کے سلسلے میں قیمتی نکات ملتے ہیں اگر ان میں سے بیشتر اسی موضوع پر لکھے گئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان میں وہ تازگی اور ہمہ گیری ہے کہ تھکن کا احساس نہیں ہوتا۔ عورتوں میں خوش ہونے اور خوش کرنے کی صلاحیت مردوں سے

زیادہ ہوتی ہے۔ یہی صلاحیت خطوں کی جان ہے۔ شاید اسی لئے یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ خط لکھنا عورتوں کا حصہ ہے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ دنیا کے بہترین خطوط خواتین ہی کے قلم سے سرزد ہوئے ہیں۔

مکتوب نگاری چونکہ ادب کی سب سے آسان صنف ہے اس لئے یہ خوب پروان چڑھی۔ آپ کے تعلقات میں اس کی جواہریت ہے اسے آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بات غلط نہیں ہے کہ اس فن پر کتاب لکھنا، معاشرت کے سارے گوشوں کو سمیٹنا ہے۔ بہر صورت ہماری دنیا میں یہی ایک رسم ہے جو عالمگیر ہے۔ رومانی دور میں بعض کامیاب مکتوب نگار پیدا ہوئے۔ چارلس لیب اپنے مضامین ہی کے لئے مشہور نہیں اس کے مکاتیب بھی ادب کا سرمایہ ہیں۔ لیب کی زندگی اور اسلوب میں وہی بات ہے جو گرمیوں کی چاندنی میں ہوتی ہے۔ اس کے مزاج میں ہلکی سی افسردگی پائی جاتی ہے۔ اسلوب دھیمہ ہے لیکن اس کی تہوں میں جذبات کی گرم رو ہے۔ اس کی سادگی میں انجیل کی پہیلیوں کا رنگ ہے اور وہ رمانیت ہے جو دنیا کو پر اسرار بنا دیتی ہے۔ اس کے مضامین اور خطوط میں وہ خون ہے جسے ہم اور آپ علم کہتے ہیں۔ اُن میں شہری زندگی، تنہائی کے مزے اور محبت کی حکایتیں ہیں۔ زندگی کے وہ لطائف ہیں جو محض اسپارٹا کے شہری بیان کر سکتے ہیں اور موت کا ذکر اس انداز میں ہے کہ انسانوں سے محبت کر لے کو جی چاہتا ہے۔

چارلس لیب کے بعد کیٹس کے خطوط ہیں، شیلی اور بائرن کے خطوط ہیں۔ سیاست دانوں، نقادوں اور مذہبی پیشواؤں کے خطوط ہیں لیکن جو نظر، ندرت اور نیرنگ کیٹس کے خطوط میں ہے وہ ان لوگوں کے یہاں کیا ہے اپنی محبوبہ کو جو مکاتیب اس نے لکھے ہیں، وہ گھلتی ہوئی برون سے زیادہ حسین ہیں۔ یہ صرف تشبیہ نہیں ہے اس لئے کہ کیٹس ان خطوں میں خود برن کی طرح پگھلتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی زندگی عرقی کا تغزل تھی اور وہ وقت سے پہلے شرار ہو کر عرقی کی طرح جو ان مر گیا۔

اس جائزہ سے ہمیں دو تین باتیں معلوم ہوئیں۔ مکتوب نگاری باقاعدگی کے ساتھ سرو کے دور میں شروع ہوئی۔ بلاغت کے اصولوں نے اس فن کو صبح کی سادگی سے محروم کر دیا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ غار دھلتا گیا۔ انگلستان میں مکتوب نگاری کا آغاز اطالوی کے ترجموں سے ہوا اور مکاتیب کئی مرحلوں سے گزرے۔ ان میں بہترین مکاتیب ان لوگوں کے ہیں جن کی زندگی خاص معنی میں علمی زندگی تھی، دوسرے جو علمی زندگی سے ایک حد تک آشنا تھے، لیکن جنکے اپنے عمل کا دائرہ محدود تھا۔ ان باتوں کے علاوہ دلچسپی کی خاطر یہ بھی یاد رکھئے کہ دنیا کے بہترین خطوط عورتوں اور شاعروں کے مرہون ہیں۔

اس روشنی میں ہمیں اپنے سرمایہ پر نظر ڈالنی ہے۔ ہماری زبان میں مکتوب نگاری کی ابتدا غالب سے ہوتی ہے۔ ان سے پہلے بھی یہ ذوق عام تھا لیکن خواص کی ادبی زبان فارسی تھی۔ چنانچہ رقعات عالمگیری کے علاوہ جو مکاتیب شمالی ہند کے بزرگوں نے لکھے ہیں وہ اس فارسی میں ہیں جو کانٹے میں تولی جاسکتی ہے۔ القاب و آداب

شرمناک حد تک تکلف سے پُر ہیں۔ غلام امام شہید، غلام غوث بے قر، قتیل اور دوسرے ادیبوں کے مکاتیب جو کتاب کی صورت میں موجود ہیں مکاتیب نہیں ہیں ہمات ہیں۔ اس دور کے اعتبار سے یہی انداز تحریر فطری تھا لیکن قیمتی سے ہمارے لئے ان میں دلچسپی کا کوئی سامان نہیں۔ غالب سے پہلے شاید لوگ زندگی کو دور سے دیکھنے کے عادی تھے۔ انھوں نے زندگی کو ہرت کے نہیں دیکھا تھا۔ غالب ذہنی طور پر اپنے پیشروؤں سے کہیں زیادہ بیدار تھے۔ انھوں نے فن کو زندگی پر فضیلت نہیں دی۔ ان کی زندگی ان کے فن کا وسیلہ بن گئی۔ یہی وجہ ہے کہ غالب جو کچھ اپنی روزمرہ کی زندگی میں نظر آتے ہیں وہی شاعری میں ہیں اور وہی اپنے خطوط میں ہیں۔ اس باطنی صداقت کی بدولت اردو شاعری ان کے ہاتھوں میں آکر کچھ سے کچھ ہو گئی، یوں سمجھئے کہ غالب کے آتے ہی اردو شاعری اپنی ٹھوڑی کو کف دست کا سہارا دیکر کسی فکر میں ڈوب گئی۔ ان کے مکاتیب زبان کے ارتقا میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آزاد نے بھی تھوڑے بہت خطوط ترکہ میں چھوڑے لیکن ان میں زندگی کی دلچسپیاں کہیں نہیں ملتیں۔ سرسید، حالی، شبلی، اکبر اور مہدی کے مکاتیب میں شبلی اور مہدی کے خطوط غنیمت ہیں لیکن ان کا جائزہ لینے کے لئے تفصیل کی ضرورت ہے۔

خورشیدالاسلام

## طوفانِ محبت

حضرت ہوش بلگرامی، المناطیب بہ ہوش یار جنگ کی معیاری ثنوی، جس میں حسن و عشق کا دلہ وزداستان اس زبان اور لب و لہجہ میں بیان کی گئی ہے جس کو اب دنیا ترس رہی ہے اور کہیں نہیں پاتی۔

اس ثنوی کو وہ خصوصیت جو کسی اور ثنوی میں نہیں پائی جاتی یہ ہے کہ اس میں مذہب و اخلاق کے نکات بھی انتہائی دلآویز رنگ میں بیان کئے گئے ہیں۔ ابتدا میں قاضی مصنف نے ثنوی نگاری پر تاریخی و تنقیدی روشنی بھی ڈالی ہے اور حضرت نیاز فتحپوری کا ایک بسیط مقدمہ ہے جس میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ”فنی محاسن اس ثنوی میں جا بجا اتنے بھرے ہوئے ہیں کہ ان کو میں سمیٹ سکتا ہوں اور نہ وجدان ان کی وضاحت سے مطمئن ہو سکتا ہے۔“ ظاہری حسن کے متعلق غالباً اس قدر کہنا کافی ہوگا کہ وہ بہترین بیرونی طائپ میں چھپی ہے اور نہایت دبیر ولایتی کاغذ پر چھپی ہے۔

ضماست ۲۹۸ صفحات - قیمت مجلد سات روپیہ - غیر مجلد پانچ روپیہ

لئے کا پتہ:- سکریٹری نواب ہوش یار جنگ - سرفراز منزل - برکت پورہ - حیدرآباد - دکن

مینجر نگار - لکھنؤ

# نظامی گنجوی اشتراکیت پسند شاعر تھا

(روس کے زاویہ نگاہ سے)

اس وقت تک تاریخ پر جن کی نظر ہے، وہ واقع ہیں کہ روس میں سوویٹ نظام قائم ہونے کے وقت سے سرمایہ داری نے روس کے خلاف پروپیگنڈا کرنے میں کسی وقت کوتاہی نہیں کی۔ جنگ کے زمانہ میں مجبوراً روس کی موافقت کرنا پڑی اور وہ مذہب پرست بھی بتایا گیا مگر لڑائی ختم ہوتے ہی وہ پروپیگنڈا پھر شروع ہو گیا اور علمی اخلاقی مورچے پر بھی یہ جنگ جاری کی گئی۔

لیکن اس کے باوجود سوویٹ نظام مضبوط ہوتا رہا اور سرمایہ داری نئی مشکلوں میں مبتلا ہوتی گئی۔ دوسری جنگ عظیم اسی کا نتیجہ تھی۔ اور اس جنگ کو فتح کر لینا سوویٹ سوشلسٹ نظام کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ دنیا کو یقین دلادیا گیا ہے کہ روس میں ڈکٹیٹری اور جبر کی حکومت ہے۔ مگر اسی حکومت نے ”جرمن ہارمشین“ کے پرچھے اڑا دیے! کہا جاتا ہے کہ وہاں شخصی آزادی مفقود ہے، انفرادی جوہر ایسے نظام میں ترقی نہیں کر سکتا۔ مگر دوران جنگ میں سوویٹ فوجیوں اور شہریوں نے جانپازی اور وطن پرستی کی لافانی مثالیں قائم کر دیں! وفاقی جمہوریوں کو اعلان کر کے سوویٹ وفاق سے الگ ہو جانے کا حق تھا اور جنگ کے دوران میں ان کو اپنی فوج رکھنے اور غیر ملکوں سے سیاسی ناتہ جوڑنے کا حق بھی مل گیا۔ مگر ان قوموں نے کسی دور میں بھی ان میں سے کسی حق کا استعمال کرنا پسند نہیں کیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سوویٹ نظام دنیا کے کلچر کے لئے خطرہ ہے۔ مگر سوویٹ یونین کی تمام قوموں نے نظامی گنجوی کی آٹھ سوویں سالگرہ قومی تہوار کی طرح منائی۔ یہ کلچر کو مٹانے کی بات تھی یا پورے عہد تاریخ کی انسانی کلچر کی ترقی کی قدر و قیمت جاننے کی۔

علمی نقطہ نظر سے دیکھئے تو نظامی کی یہ قدر و منزلت جو آج سوویٹ علاقے میں ہے، ثابت کرتی ہے کہ کلچر کا مدعی و محافظ صرف سوشلسٹ نظام ہی ہو سکتا ہے۔ سوویٹ نظام علم و فن کو سب سے بلند مقام دیتا اور سوشلسٹ اصول بنیاد ثابت اور انسانی بھائی چارہ سکھا ہے۔ یہی اصل ہے اس بات کی کہ ہر سوویٹ قوم کی تاریخ میں سے قومی ہیرو نکالے اور زندہ رکھے جا رہے ہیں۔ ایسے کردار ابھارے جا رہے ہیں جنہوں نے اپنے زمانہ میں قوم کی خدمت کی، آزادی کا سبق دیا اور انسان پرستی سکھائی۔ ان کے محاسن و کمال اجاگر کئے جا رہے ہیں اور ان کو سارے سوویٹ عوام سے روشناس کرایا جا رہا ہے۔

اور سوڈیٹ روس میں یہ کام قومی کام کی طرح برابر جاری ہے۔

نظامی گنجوی کے ادبی فن سے سوڈیٹ قوموں کی گہری دلچسپی اور انہماک جو اس سالگرہ کے موقع پر ظاہر ہوا، اسے ہنگامی اور وقتی نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ نظامی پر ریسرچ کا کام برسوں سے ہو رہا تھا۔ سوڈیٹ یونین کے ادارہ ترقیات کی شاخیں ہر وفاقی جمہوریہ میں قائم ہیں۔ ازبکستان (باشقند) کی شاخ نے علماء و ماہرین کی ایک جماعت کو مستقل نظامی پر تحقیق کے لئے مقرر کر رکھا ہے۔ اس جماعت کا سرخیل پروفیسر پریل ہے جو ایک بلند پایہ مستشرق اور سوڈیٹ یونین کی اکادمی آف سائنسز (جامعہ علوم) کا ممبر ہے۔ باشقند کو نظامی پر ریسرچ کا مرکز غالباً اس لئے بنایا گیا کہ مشرقی مخطوطات کا ذخیرہ جتنا تاشقند میں ہے دنیا میں کہیں نہیں، اس کتب خانے میں فارسی، عربی اور ترکی کے پچھتر ہزار نسخے قلمی ہیں اور پچیس ہزار ایسی مطبوعہ تصانیف ہیں جن میں سے اکثر نایاب ہیں۔ چنانچہ اس تحقیقاتی ادارے نے کلام نظامی کے مختلف زمانوں میں لکھے ہوئے نسخے مقابلہ کر کے صحیح کئے۔ برٹش میوزیم میں چودھویں اور پندرھویں صدی کے لکھے ہوئے نسخوں کے فوٹو فراہم کئے گئے اور اس طرح خمسہ نظامی غلطیوں سے پاک ہو کر ایک مستند نسخے کی شکل میں ایک بسوط مقدمے کے ساتھ شائع کیا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ کلام نظامی کا ترجمہ سوڈیٹ کی دوسری زبانوں میں بھی شائع کیا گیا۔

ریسرچ کے اس کام میں بہت سا ایسا مسالا بھی دستیاب ہوا جس کا پہلے کسی کو علم نہ تھا۔ کلام نظامی پر جدید تحقیق کی روشنی میں بحث کی گئی اور نظامی کے فلسفہ زندگی پر پوری روشنی ڈالی گئی ہے۔ نئی معلومات کی روشنی میں نئے زاویوں سے کلام کو سمجھا گیا اور طویل بحثوں کے بعد عہد نظامی کی زندگی کو جانچا گیا اور نظامی کے فن کی قدریں قائم کی گئی ہیں۔ یہ تحقیق و مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ نظامی ہر و استبداد کا دشمن اور عوام الناس کا بڑا ہمدرد تھا۔ نظامی ہمیشہ تنگدستی کی زندگی گزارنے ہی میں خوش رہا اور کسی دربار سے تعلق پیدا نہیں کیا۔ ورنہ نظامی کے لئے بڑے سے بڑے دربار کا دروازہ کھل سکتا تھا۔

نظامی ہر ریسرچ نے ثابت کر دیا ہے کہ اسے اپنے آس پاس کی زندگی سے گہرا لگاؤ تھا، ماحول کا پورا احساس تھا، زندگی پر اس کی نظر حکیمانہ پڑتی تھی اور زمانے کو ترقی پسندانہ نظر سے دیکھتا تھا۔ پڑانے "تاریخ نو بیسویں" نے نظامی کا سال وفات قائم کرنے میں دھوکا کھایا ہے۔ وہ ۱۲۱۱ھ تک زندہ رہا۔

غرض، سوڈیٹ قوموں کی نظر میں نظامی ایک عظیم المرتبت شاعر ہونے کے علاوہ ایک بڑا مفکر و معلم بھی تھا اس لئے وہ بیس کروڑ سوڈیٹ انسانوں کا ہیرو ہے، ساحل بالنگ کی جمہوریوں سے نظامی کا تعارف اس جنگ کے بعد ہی ہوا، جہاں کے ایک بڑے شاعر کا قول ہے کہ "ہمارے لئے نظامی کی ذات ایک الہام ثابت ہوئی!"

نظامی پر اس مستقل تفتیش و تحقیق کے علاوہ جو برسوں سے ہو رہی تھی، اس سالگرہ کے موقع پر پوری سوڈیٹ یونین میں ہزاروں اخباروں اور رسالوں میں بے شمار ایڈیٹوریل، مقالے اور تبصرے شائع ہوئے اور

مستند اہل قلم نے خراج عقیدت پیش کیا۔ اس کے علاوہ لکچروں، ڈراموں اور اسکیموں کی شکل میں نظامی کے فن و شخصیت کو سوویٹ یونین کے ہر حصے میں اجاگر کیا گیا۔

سوویٹ نقادوں کے خیال میں نظامی کے محاسن شعر و ادب اور اس کی تعلیمی و اخلاقی قدروں میں امتداد زمانہ سے کوئی کمی نہیں ہوئی، بلکہ اس میں اور اضافہ ہی ہوا ہے۔ جس کی وجہ نظامی کا مسلک انسانیت پرستی ہے۔ سوویٹ نقاد کا عقیدہ ہے کہ نظامی کا پیغام پوری نوع انسان اور ہر زمانہ کے لئے تھا! وہ کہتے ہیں کہ ہر چند نظامی سامنتی سماج میں پیدا ہوا اور جبر و تعدی کے دور میں جیا مگر ہمیشہ ایک پرمسرت زمانہ کا خواب دیکھتا رہا، ایک خوش و خرم عہد کا منظر رہا کہ وہ آکر رہے گا! ایک سوویٹ صحافی نے لکھا ہے کہ:-

”حیرت ہے کہ نظامی نے جس یوٹوپیا کا تصور قائم کیا تھا وہ ہمارے سوشلسٹ نظام سے تصور میں ملتا جلتا تھا!“  
سوویٹ نقادوں کا فیصلہ ہے کہ نظامی پوری طرح محسوس کرتا تھا کہ عام انسانوں کو آزادی و مسرت کی کیسی زبردست آرزو ہوتی ہے! اور اسی احساس نے نظامی کو وقار انسانیت کا مسلک دکھایا! سوویٹ تبصرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ نظامی کے خوابوں کی تعبیر پوری ہونے کے لئے آٹھ سو سال کی مدت درکار تھی اور وہ تعبیر اسٹالین کے ان لفظوں میں بیان ہوئی ہے:-

”انسان کائنات کا سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ ہے۔ اس لئے سلج کا مقصود انسانی خیر و بہبود ہونا چاہئے!“  
ایک نقاد فخریہ لکھتا ہے کہ:-

”آج نظامی اپنے مقبرے سے نکل آئے تو دیکھے کہ اس کی قوم دوسری سوویٹ قوموں کے ساتھ مل کر کسی طرح آزادی کا پرچم لہرا رہی اور غلامی و تشدد کے غلات جنگ کر رہی ہے!“

نظامی نے کہا ہے کہ ”آزادی کی نان جویں غلامی کے پلاؤ تو رے سے بہتر ہے۔“ مگر یہ نقاد کہتا ہے کہ آزادی و مختاری کے لئے جو کی روٹی کھانا لازم نہیں ہے۔ سوویٹ قومیں آزاد و مختار ہو کر زندگی کے لئے اچھی چیزیں پیدا کر رہی اور زندگی کی تمام نعمتوں سے متمتع ہیں!

سوویٹ یونین نظامی کو ”اپنا“ کہتی اور سمجھتی ہے؟ اور اس کی یہ قدر و منزلت صرف اس بناء پر نہیں ہے کہ وہ اس علاقے میں پیدا ہوا تھا بلکہ اس کی خاص وجہ نظامی کا وہ پیغام ہے جو سوشلزم سے قریب تر ہے۔

ایک سوویٹ مصنف کہتا ہے کہ نظامی کی جنم بھومی، آذربائیجان بلاشبہ بہت سی قوموں کے مقابلہ میں قدیم کلچر کی مالک ہے۔ نظامی کی لافانی شاعری شیکسپیر کی شاعری سے چار سو سال پہلے کی ہے۔ اور سوویٹ قومیں اپنے اس کلچری ورثے پر فخر و ناز کرتے ہیں حتیٰ بجانب ہیں۔

دوسری خصوصیت جس کی وجہ سے سوویٹ یونین میں نظامی کی عظمت قائم ہوئی، یہ ہے کہ نظامی نے کہا ہے کہ:-

”علم و برہان انسان کو آقائے کائنات بنا سکتے ہیں!“ سائنس کی جتنی اہمیت سوویٹ نظام کے اندر ہے، کہیں اور نہیں ہے۔ وہاں اگر سائنس اور فن و صنعت سے اتنا کام نہ لیا جاتا تو یقیناً سوویٹ طاقت اس درجہ کو نہیں پہنچ سکتی تھی جہاں وہ آج ہے! اور یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ علم و فن اسی سماج میں آزادانہ ترقی کر سکتا ہے جہاں انسان کی محنت آزاد ہو اور سماجی و نسلی حد بندیاں نہ ہوں! تصور و خیال کی یہ ہم آہنگی ہے جس کی بناء پر سوویٹ قومیں اس عظیم المرتبت شاعر و حکیم کی تقریب مناکر خراج تحسین و عقیدت پیش کرنے پر مجبور ہوئیں۔ اور یہی وہ وعدت مقصد ہے جسے سوویٹ قوموں کو اس آقائے تحریر اور مجدد انسانیت کی پرستش پر آمادہ کر دیا جس نے وسطی عہد کی تاریکیوں کے اندر نوع انسان کے جگمگاتے مستقبل کو دیکھ لیا تھا۔

حسن اتفاق کی یہ ایک عجیب مثال ہے کہ نظامی کی آٹھ سوویں سالگرہ اور انقلاب کی تیسویں سالگرہ ساتھ ساتھ پڑیں۔ ایک نقاد کے خیال کے مطابق یہ تقریب اگر انقلاب روس سے کچھ پہلے پڑتی تو بہت تھوڑے لوگ نظامی کو جان سکتے۔ ایک نقاد کہتا ہے کہ:-

”پرانے زمانہ کے آذربائیجانی اس قابل کیونکر ہو سکتے تھے کہ اپنی قوم کے اس شاعر اعظم کے فن سے اس کے شعر اور فلسفے سے فیض پاتے؟ نظامی کی تصانیف خود نظامی کی زندگی میں نادرونایاب تھیں، اور بعض دیہاتی شاعریاں بھاٹ اس کا کلام سنا کر اگر اپنی معاش پیدا کر لیتے تھے تو انھیں نظامی کے فن کی قدر کیا ہو سکتی تھی؟“ اسی نقاد نے لکھا ہے کہ:-

”بعد کے زمانہ میں ایشیا کے مختلف حصوں میں نظامی کے بتج میں کم و بیش ایک ہزار جیسے لکھے گئے۔ نظامی کے نقل کرنے والے یہ تمام شاعر و دراصل دنیا کے فن اور کلچر کے محسن ہیں جنہوں نے اس کی نقل و اتباع کر کے نظامی کو زندہ رکھا۔“

سوویٹ اہل فن و کمال نے نظامی کو جو بلند درجہ دیا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے خیال میں نظامی نے ترقی یافتہ کلچر میں بیش بہا اضافہ کیا اور ایشیا کے بہت بڑے علاقہ کو صدیوں تک تہذیب و ترقی کی مشعل دکھائی۔ سوویٹ اہل کمال اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ سوویٹ نظام کے وجود میں آجانے سے اس نے مختلف نسلوں اور قوموں کے درمیان بھائی چارے اور انسانی برابری کی بنیاد رکھی اور جو کلچری ترقی کی، اس کے بغیر نظامی کا مرتبہ پہچانا نہ جاسکتا اور وہ اپنی مسند بلند پر بیٹھا یا نہ جاسکتا تھا۔ روسی اشتراکیت نے سوویٹ قوموں کو خاص کر آذربائیجانی قوم کو اس کا کھویا ہوا میر و اور معلم ڈھونڈ دیا اور اس طرح ان تمام قوموں کو انسانی محاسن و کمال اور اس سب کا وارث بنا دیا جو ترقی پسندانہ ہے! سالگرہ کی اس تقریب کے موقع پر پروفیسر برٹیل لکھتا ہے کہ:-

”مغربی یورپ نظامی کو صدیوں سے جانتا ہے، گیتے نے آسٹری مشرق، ہیرر گشال کے ترجمے میں



اپنے وطن کی سر زمین سے گہرا لگاؤ تھا۔

آذربائی ادیب، عزیز شریف نے لکھا ہے کہ:-

”شاہ شیروان نے نظامی کے پاس افسانہ لیلیٰ مجنوں کو نظم کرنے کی فرمائش بھیجی اور شرط لگا دی کہ مثنوی فارسی

زبان میں ہو، کیونکہ ترکی زبان میں وہ لوہج اور نفاست نہیں جو شاہی دربار کے ذوق و شہتگی سے ہموا ہو سکے

نظامی نے تعمیل تو کی مگر اس شرط کے متعلق اپنے ناخوشگوار محسوسات کا ذکر اسی مثنوی میں کر دیا ہے۔“

جس زمانہ میں نظامی نے اپنے ادبی شاہکار پیدا کئے، وہ زمانہ آذربائیجان کے کلچری و اقتصادی عروج کا زمانہ تھا۔

گنجه جہاں نظامی پیدا ہوا، ایک بڑا سیاسی و کلچری مرکز بنا ہوا تھا، اور چونکہ قافلوں کی شاہراہ پر تھا اس لئے بہت

بڑی تجارتی منڈی تھا۔ راجدھانی ہونے کے باعث صنعت و صناعت میں بے اندازہ ترقی تھی اور دولت کی فراوانی

کے باعث ہزاروں اہل علم و کمال اور ہرفن کے دستکار کھچے چلے آتے تھے۔

۱۲۲۵ء کے مغل سیلاب میں گنجه بھی بہ گیا مگر پھر حیدر علی کے فاصلہ پر آباد ہو گیا۔ نظامی کا مقبرہ موجودہ شہری آبادی

سے ذرا فاصلہ پر ہونے کا سبب یہی ہے۔ لیکن اس مقبرے کی زیارت کے لئے معتقدین کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا اور ہر وقت

تائتا بندھا رہتا ہے۔ مقبرے کی دیکھ بھال کا خاص انتظام ہے اور بہترین حالت میں رکھا جاتا ہے۔

آذربائیجان دو حصوں میں بٹ گیا ہے۔ شمالی حصے میں سوویت روس کی وفاقی جمہوریہ آذربائیجان قائم ہے اور

جنوبی حصہ مملکت ایران کا جزو ہے۔ نظامی کے عہد میں پورا آذربائیجان ایک تھا جو یکے بعد دیگرے کئی حکمرانوں خاندانوں

کے زیر نگیں رہا۔ عہد نظامی میں اس علاقہ کی حکمرانی سلجوقی خاندان کے ہاتھوں میں تھی۔

آذربائیجان کی کلچری روایات نہایت شاندار ہیں، جن خاندانوں نے اس علاقہ پر حکومت کی، ان کے جاہ و چشم کی نشانیاں

محلات و مقابر کی صورت میں آج بھی باقی ہیں۔ اس زمانہ کا آذربائیجان پورے مشرق میں برترین کلچر کا ماوے و مرکز تھا۔

فن تعمیر کے اعلیٰ اور شاندار نمونے جو اس وقت تک محفوظ ہیں، چینی، دھات اور سٹی کے برتن جو محفوظ رہ سکے اور

زمین کے اندر سے نکالے گئے، اس زمانہ کی شاعری و ادب کے نمونے اور سیاحوں کے بیان، یہ سب چیزیں اس بات کی

شہادت ہیں کہ دور وسطیٰ کا آذربائیجان اس عہد کے یورپ کے مقابلے میں سائنس اور صناعت کے اعتبار سے بہت ترقی پاتے

تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس عہد میں آذربائیجان نے نہایت تیز ترقی کی اور اس کی دولت میں زبردست اضافہ ہوا جس کے

باعث آذربائیجان کلچر نے بلند سی حاصل کی۔ اس وقت کے آذربائیجان میں گنجه کے علاوہ شامہ، تیلیاکن، بردہ، تبریز اور

نخشوان بڑے آباد شہر اور کلچری مرکز تھے۔

لیکن اس عہد میں بھی عوام الناس کے اندر بے چینی پائی جاتی تھی۔ جاگیر داری کے خلاف عوام سرکشی پر آمادہ

ہوتے تھے مگر جبر و تعدی انھیں بے بس کر دیتی تھی۔ اس عہد میں صناعت و اہل علم بھی اپنے انسانیت کش حکمرانوں کے

علم کا شکار ہوتے تھے۔ نظامی سے پہلے اور اس کے بعد کے زمانوں میں بھی ترقی پسند اہل علم و کمال جلا وطنی میں عمریں گزارنے پر مجبور ہوتے تھے۔

اوپر کہا گیا ہے کہ نظامی کو اپنے سماج کی عوامی زندگی سے لگاؤ تھا اور عوام الناس کی خدمت اس کا مطمح نظر تھا۔ اس کے عہد میں جاگیر داری نظام نے عام انسانوں کی ترقی کی راہیں روک رکھی تھیں اور حصول اخلاق اور انصاف سے محروم کر رکھا تھا۔ نظامی نے نوع انسان کو انھیں باتوں کی تعلیم دی۔ کلام نظامی اسی حقیقت کا زندہ ثبوت ہے۔ اس نے اپنے ادب میں جتنے کردار پیش کئے وہ بالعموم محنت کش انسان ہیں، کوئی سنگتراش ہے تو کوئی چرواہا، کوئی غلام ہے تو کوئی دستکار۔ اور اس عہد کی پوری تاریخ ادب میں نظامی پہلا شاعر و ادیب ہے جس نے اپنی شاعری میں شاہ و شاہزادوں کی جگہ عام انسانوں کا ذکر کیا۔ دنیا کے اس حصے میں جہاں فارسی زبان رائج تھی، ادب کے اندر اعلیٰ طبقے کے کردار جگہ نہ پاتے تھے، کیونکہ ادب و صنعت ہی تھی درباری چیز۔

تاریخ میں نظامی کی زندگی کے حالات کو جگہ نہیں ملی۔ مگر سو ویٹ نقادوں کی دیدہ ریزی اور دماغ سوزی کی بدولت خود کلام نظامی سے اس کی زندگی کے متعلق کچھ معلومات فراہم ہو گئی ہیں۔ نظامی کے باپ کا نام یوسف تھا اور وہ خاص گنجہ کا باشندہ تھا۔ نظامی نے اپنی ماں کو ایک ”کروخاتون“ کہا ہے۔ باپ کا انتقال ہو جانے کے باعث نظامی کو حصول معاش میں اپنی ماں کا ہاتھ بٹانا پڑا۔ نظامی کی تعلیم کینہ مکر ہوئی، اس بات کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ مگر نظامی کا کلام شاہد ہے کہ اس زمانہ کے معیار کے مطابق اس نے اعلیٰ تعلیم پائی تھی۔ وہ عربی فارسی کا ماہر تھا اور انبیات، فلسفہ، نجوم اور کیمیا وغیرہ میں پوری دستگاہ رکھتا تھا۔ اس کی زندگی کے متعلق جتنی معلومات ہم پہنچتی ہیں، اس سے پتا چلتا ہے کہ نظامی کی زندگی اہم واقعات و روایات سے خالی تھی۔ نظامی کا سیر و سفر کے لئے ٹکنا بھی ثابت نہیں ہوتا۔ جو بات روز روشن کی طرح ظاہر ہے وہ یہ ہے کہ نظامی کی ذہنی و روحانی زندگی غیر معمولی حد تک کامیاب تھی۔ اس کا ثبوت خمسہ نظامی کا تقریباً ہر شعر میں کرتا ہے۔

نتیجہ نکالا گیا ہے کہ ۱۳۱۵ھ یعنی تیس سال کی عمر میں نظامی نے شادی کی، مکی بیوی کا نام آفاق تھا۔ آفاق ایک کینز تھی جو امیر کے دربار سے تحفے میں ملی تھی۔ نظامی کو آفاق سے گہری محبت ہو گئی تھی۔ شادی کے آٹھویں سال لڑکا پیدا ہوا جس کا نام محمد رکھا گیا مگر آفاق زچگی ہی میں مر گئی۔ محبوب بیوی کی موت سے نظامی کو سخت صدمہ ہوا۔ بیوی کی موت سے چند ہی روز پہلے نظامی نے اپنی پہلی مثنوی خزینۃ الاسرار مکمل کی تھی۔ اس مثنوی میں نظامی نے انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے بحث کی ہے۔ نظام سلطنت اور انسانی محنت پر اظہار خیال کیا ہے اور کتاب کی ہر فصل ایک ایسی حکایت پر ختم ہوتی ہے جس سے شاعر کی قوت استدلال بخوبی ظاہر ہوتی ہے۔

اس وقت کے عام رواج کے مطابق نظامی نے خزینۃ الاسرار کو شاہ فخر الدین سے معنون کیا ہے۔ بعد ازاں

بھی کسی نہ کسی شاہ دامیر سے منسوب کی گئی ہیں۔ سوویٹ نقادوں کے خیال میں اس تہذیب کا منشا اس کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا کہ طرز حکمرانی اور نظام حکومت کے متعلق نظامی کے خیالات بادشاہوں تک پہنچے جائیں تاکہ وہ حق و انصاف کو اپنا شعار بنالیں۔

نظامی کی شاہکار شہنوی ”شیریں خسرو“ آفاق کی موت کے بعد کی تصنیف ہے۔ اور بلاشبہ یہ شہنوی لکھ کر نظامی نے آفاق کے ساتھ اپنی محبت کی یادگار قائم کی ہے۔ شیریں خسرو پورے مشرق میں پہلی افسانوی شعری تصنیف تھی جو نظامی کی شہرت و عظمت قائم کر دینے والی ثابت ہوئی۔

اس کے بعد شاہ شیر و آں نے فرمایش کی کہ لیلے مجنوں کے افسانے کو فارسی زبان میں نظم کیا جائے۔ مگر چونکہ یہ شرط نظامی کی خود داری کے منافی تھی، اس لئے نظامی انکار کر دینا چاہتا تھا، مگر اس کے لڑکے محمود نے اصرار کیا اور باپ کو مجبور ہو جانا پڑا۔ محمود اس فرمایش کی تعمیل کو اپنے دربار میں پہنچے جانے کا ذریعہ بنانا چاہتا تھا۔ محمود خود بھی شاعری کرتا تھا۔

چنانچہ عشق و محبت کی یہ داستان چار مہینے کی مدت میں مکمل ہو گئی، اور محمود اسے خود لیکر شاہی دربار میں پہنچا۔ اس واقعے سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ نظامی دربار داری سے متنفر تھا۔ شاہ شیر و آں نے محمود کو اپنے چھوٹے شہزادے کا رفیق و مصاحب مقرر کر دیا۔ مگر بہت جلد محمود کے سامنے درباری ماحول کا طمع اُتر گیا، وہ فضا اسے راس نہیں آئی اور محمود وطن واپس چلا آیا۔

لیلے مجنوں لکھنے کے آٹھ سال بعد شہنوی ہفت پیکر لکھی گئی۔ یہ خاص بات یاد رکھنے کی ہے کہ نظامی نے اپنی ادبی و شعری صناعت کے لئے جتنے موضوع اختیار کئے وہ سب تاریخی تھے اور اس ذیل میں نظامی اور شیکسپیر میں خاص مماثلت ہے۔ ان دونوں عظیم المرتبت شاعروں نے جس موضوع کو لیا اسے لافانی شاہکار بنا دیا۔

نظامی کے مجموعہ کلام میں شہنوی ہفت پیکر سب سے بہت اہم تصنیف ہے۔ اس میں خیال کا تمول، تصور کا حسن، نفسیات انسانی پر گہری نظر اور عوام الناس سے قریبی تعلق کا اظہار وہ خوبیاں ہیں جو اس شہنوی کی قبولیت کی ضامن بن گئیں۔ سکندر نامہ، نظامی کی آخری تصنیف ہے۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ سکندر نامہ نظامی کے فن و کمال کا مکمل ترین نمونہ اور اس کے فلسفہ حیات کا مستند آئینہ ہے انسانی مسرت کا جو خواب نظامی نے دیکھا تھا وہ سکندر نامہ میں پوری طرح بیان ہو گیا ہے۔

سوویٹ نقاد نظامی کے مطالعہ سے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سماجی اوپنچ نیچے اور نابرابری نظامی کے لئے سوہان روح بنی رہتی تھی، اور اس کا پوری عمر کا سوچ بچار اسی مسئلے کے حل میں لگا رہا۔ نظامی زندگی کے جن مسئلوں کا حل ڈھونڈ رہا تھا وہ ایسے مسئلے ہیں جو انسانی سماج کے اندر تضاد و مخالفت سے پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ نظامی نے

سکندر نامہ میں ایک ایسے حکمران کی تصویر پیش کی ہے جو صرف بادشاہ ہی نہیں بلکہ فلسفی و دانشور بھی ہے! پوری ٹنوی میں نظامی نے اس حکمران کو حق و انصاف کا زبردست محافظ بنا کر پیش کیا ہے جو بالآخر ایک ایسا سماج بنا لیتا ہے جس کے اندر آقائی و غلامی ناپید ہے۔

سکندر نامہ نظامی کے فلسفہ حیات کا مکمل نقشہ اس لئے ہے کہ اس میں نظامی نے بنا ذات پات کا سماج بنانے کی صورتیں بتائی ہیں اور اپنے اصول کے مطابق سماج اور حکومت کا نقشہ پیش کرتے ہوئے اپنی شاعرانہ جینیں کے زور و قوت اور اپنی فلسفیانہ و حکیمانہ فراست کی گہرائی اور پہنائی بھی ثابت کر دی ہے۔ اور یہ کمال آج نہیں بلکہ آج سے آٹھ سو سال پہلے کی دنیا میں دکھایا ہے! وہ آٹھ سو سال آگے دیکھ لینے والی نظر اور بصیرت رکھتا تھا!

سوویٹ نقادوں کے خیال کے مطابق وہ ارض موعود و وہ جنت ارضی جس کا نقشہ نظامی نے بنایا تھا، سائے کے روسی انقلاب نے اس نقشے میں رنگ بھرا! یا یوں کہئے نظامی کے خوابوں نے جسم اختیار کر لیا!

نظامی کے ہم وطن ادیب و نقاد، عزیز شریعت آذربائیجانی نے لکھا ہے کہ نظامی نے اپنی اس یوٹوپیا کے لئے زمین کا جو حصہ منتخب کیا تھا وہ جغرافی اعتبار سے شمالی علاقہ قرار پاتا ہے۔ نظامی کا یہ اشارہ فی الواقعہ ایک پیشگوئی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے کہ سب سے پہلے وطن نظامی کے شمال میں اور اس کے بعد آذربائیجان میں محبوب خواب شرمندہ تعبیر ہوا۔

لطیف الدین احمد

## نگار کا آئندہ سالنامہ

۱۵۷

اس وقت تک کے تمام سالناموں سے مختلف ہوگا، نہ وہ ادبی ہوگا نہ انتقادی بلکہ ایک بسیط اقتصادی سیاسی تبصرہ ہوگا تمام اسلامی ممالک پر جو عہد حاضر کی پیچیدہ سیاست اور اشتراکیت و جمہوریت کی موجودہ آدیزش کے پیش نظر ایک ضخیم کتاب کی صورت میں پیش کیا جائے گا۔

یہ اقتباس ہوگا مائرس ہنڈس کی مشہور کتاب *In search of a formula* کا جس کے پیش لفظ کا نمونہ آپ ماہ مئی کی اشاعت میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

اس کے مطالعہ سے آپ کو معلوم ہوگا کہ اس وقت عالم اسلامی کس دور سے گزر رہا ہے اور جس مستقبل کی اسے جستجو ہے وہ اسے اشتراکیت کی طرف لے جا رہا ہے یا جمہوریت کی طرف۔

منیر نگار

# اُردو زبان اور رسم الخط

(مولانا عبدالملک آروی کا خطبہ صدارت بزم اُردو بھاگلپور میں)

سائنس کے جدید اکتشافات نے انسانی ذہن و قلب سے ایسے بہترے پردے ہٹا دیے ہیں، جنہوں نے انسان کو جہل و مذلت، اور تعصب و تنگ نظری میں مبتلا کر رکھا تھا، علم الانسان (انتھراپولوجی) علم الاقوام (اتھنالوجی) اور لسانیات (فایلاوجی) نے ہر بالغ، عاقل اور وسیع المطالعہ انسان کو سکھا دیا کہ دنیا میں نہ کوئی نسل خالص ہے نہ زبان، بلکہ دنیا کی ہر زبان اور ہر نسل مختلف زبانوں اور نسلوں سے مزوج ہوئی ہے، جب حقیقت یہ ہو تو ہمارا نظریہ نسل و قوم اور زبان و ادب کے لحاظ سے بہت وسیع ہونا چاہیے یہاں تک کہ سارے صفحہ ارض کے انسانوں کو ہم اپنا بھائی ساری انسانی نسلوں کو اپنی برادری اور دنیا کی ساری زبانوں کو ایک ہی تناور درخت کی چھوٹی بڑی ڈالیاں تصور کرتے لیکن انسانی فکر و احساس کے عجوبہ نواز زاوئے حیرت میں ڈال دیتے ہیں، جب ہم بڑے بڑے انسانوں کو بھی اس باب میں بہت محدود پاتے ہیں۔

آج انسانی آبادیاں جو ہمارے ارد گرد ہیں، ہمیشہ سے ایک ہی جگہ سمٹی ہوئی نہ تھیں بلکہ انسان ہجرت پسند، اور سیاحت کا دلدادہ رہا ہے، مختلف قوموں کے جتنے اپنی پسند ذوق، تلاش اور حاجت کے لحاظ سے اقصادی عالم کے مختلف حصوں میں پھرتے، بستے، پھیلتے اور پھر اترتے اور سکونت کرتے رہے ہیں، یہ ضرور ہے کہ ہمارے سامنے رہنے والے اعزہ واقربا اور پاس رہنے والی اولاد ہم پر انش و ربط کا زیادہ اثر چھوڑتی ہے، بہ نسبت ان لوگوں کے جو ہم سے دور رہتے اور ہماری غرضی و غم میں شریک نہیں ہو سکتے، یہی وجہ ہے کہ اپنے ارد گرد کی بولی اور اپنے گرو و پیش کی آبادیوں سے ہم زیادہ مانوس ہوتے ہیں اور زبان و قومیت کی بنیاد ہمیں سے پڑتی ہے، ورنہ دراصل صفحہ ارض کی ساری انسانی آبادی ایک خاندان کی حیثیت رکھتی ہے جس کو حضراتی ماحول اور آب و ہوا کے اختلافات نے رنگ و قومی زبان و عمران کے لحاظ سے مختلف قوموں اور زبانوں میں بانٹ دیا ہے۔

دنیا کے مختلف ملکوں اور قوموں کی طرح ہندوستان اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا، یہاں پہلے ڈراویدی قوم تھی پھر آریہ قومیں آئیں پھر سامی قومیں آئیں، پھر یورپیہ آئے ڈراویدی قوم کے لئے آریہ قومیں پہلے ایسی تھیں

لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا آریہ قوموں میں نئے دیس کی زبان، تہذیب اور رہن سہن سے خلط ملط ہوتا گیا یہ اجنبیت دور ہوتی گئی اور وہ بھی بھارت کے ہیوت سمجھے جانے لگے، اس کے بعد سامی قوموں میں عرب آئے کچھ سمندری راستہ سے، کچھ شمالی ایشیا کے چٹیل صحرا و دشت کو طے کرتے ہوئے پہاڑوں اور دروں سے گزرتے ہوئے سندھ تک پہنچے، یہ جتنا فاصلہ سامی نہ تھا بلکہ اسلام کے پرچم کے نیچے آریہ اور سامی قوموں، عربوں، ایرانیوں، ترکوں اور افغانیوں نے ملکر یہ ہجرت کی تھی۔ اسلام کی تحریک نے دنیا کی نسل و زبان پر گہرے اثرات چھوڑے، اسی کے سایہ میں آریائی اور سامی تہذیبوں کا زبردست سنگم ہوا، چنانچہ ہندوستان میں یہاں جلی آریائی و سامی تہذیب پہنچی تو پہلے اس سے مغایرت برتی گئی، ہر نئی چیز سے ہم رفتہ رفتہ مانوس ہوتے ہیں، آخر اس ملی جلی آریائی و سامی قوموں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا، ہزار برس سے زیادہ زمانہ گزرا یہ قوم اپنی باہر سے لائی ہوئی چیزوں کے ساتھ بھارت میں بس گئی، بارہ سو برس کے اندر یہ تہذیب اسی طرح دیس میں مل جل کر ہندوستانی تہذیب بن گئی جس طرح آریائی قوم اپنی زبان اور رسوم کے ساتھ اس سے پہلے کھپ چکی تھی، سنسکرت زبان، وید اور آریائی مذہب، تہذیب و تمدن کے دوسرے نقوش "بھارتیہ" ہو گئے تو کیا وجہ ہو سکتی ہے بارہ سو برس سے لائی ہوئی مسلم تہذیب کو جو آریائی اور سامی تہذیبوں کے ملے جلے آثار میں سے تھی، بھارت کا سرمایہ نہ سمجھیں بلکہ اس کو ایک بدیسی چیز سمجھ کر ٹھکرائیں، اس سے نفرت کریں اور اس کا دیس نکالا کرنے کے لئے ایک زبردست سازش کریں۔

اُردو زبان تو مسلمان اپنے ساتھ لائے بھی نہیں اس کے برخلاف ہندوستان میں سنسکرت زبان باہر سے آئی، آریہ قوم اپنے ساتھ یہ زبان یہاں لائی، مسلمان یہاں آئے تو ان کی زبانیں عربی، فارسی، ترکی، حبشی تھیں، انسانی نفسیات کی بنا پر پہلے ان برسیوں سے یہاں کے دیسی لوگ نامانوس رہے لیکن جب اسلام کا نام لینے والی ان ملی جلی آریائی و سامی قوموں نے بھارت ہی کو اپنا وطن بنا لیا تو سماجی ضرورتوں نے رفتہ رفتہ یہاں کے قدیم رہنے والوں کو ان سے التفات برتنے پھر انس و ربط پیدا کرنے پر مجبور کیا، اور یہیں سے ایک نئی زبان کی داغ بیل پڑی، بھارتیہ تہذیب کی قوت نے ان فاتح عربوں ایرانیوں اور ترکوں پر غلبہ حاصل کرنے والی باہلی قوم خود شومری تہذیب و تمدن کے سامنے جھک گئی اور اس نے ہزاروں برس تک شومری زبان کو اپنا رکھا، اور اس کے ساری رسم الخط کو ساری زندگی اپنائے رہی اور جس طرح ایشیائی قومیں یونان پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد بھی یونانی علوم و فلسفہ سے مغلوب رہیں اسی طرح بھارت پر ان مسلم فاتحوں کا بس نہ چل سکا، اور یہاں کی مستحکم اور شاندار تہذیب سے وہ خود بڑی حد تک متاثر ہو گئے، اُردو زبان بھارتیہ فتح کی ایک زبردست یادگار ہے، ورنہ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ یہاں عربی، ایرانی اور ترکی زبانیں رائج رہتیں، دیوناگری رسم الخط بھی ہندوستانی کی ڈرامیڈی قوم کا رسم الخط نہیں، جب اس کو ہندوستان والے قومی قرار دے رہے ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اُردو رسم الخط کو ہم بدیسی کہیں جبکہ یہاں کے مسلم دیسیوں سے گزر کر بھارت کی غیر مسلم جنتا میں بھی یہ رسم الخط

عام ہو چکا ہے اور ہندو ادب و روایات، تہذیب و زندگی کا بہت بڑا ذخیرہ اس زبان و رسم الخط میں پایا جاتا ہے۔ ہمیں اپنے وطن کے ان فاضلوں اور نیتاؤں پر سخت حیرت ہوتی ہے، جو بالکل غیر معقول بنیاد پر اردو رسم الخط کے خلاف ملک میں نفرت پھیلا رہے ہیں، اور اردو رسم الخط کے درپے ہیں، جب وہ سنسکرت اور دیوناگری رسم الخط کو ہندوستانی قومیت کا جز سمجھتے ہیں، تو پھر کیوں نہ ہم اردو زبان اور اس کے رسم الخط کو قومی سمجھیں، ورنہ ہونا تو یہ چاہئے کہ قدیم ترین ڈراویدی رسم الخط اور پراکرت کو رواج دیا جائے، کیونکہ قدیم اور دیسی ہونے کے لحاظ سے سنسکرت اور دیوناگری پر اس کو فوقیت حاصل ہے۔

آج دنیا کے وہ ہی عالمگیر مشہور اور متداول رسوم خط ہیں، لاطینی اور عربی، اردو رسم الخط عربی رسم الخط سے مستفاد ہے، یہ عربی رسم الخط نہ اسلامی رسم الخط ہے، نہ خاص مسلمانوں کی ایجاد، اسلام سے قبل عربی زبان کے جو نقوش، عمارتوں، پتھروں اور الواح قبور پر کندہ ہیں وہ صفوی، ثمودی اور لحيانی رسوم خط میں پائے جاتے ہیں، یہ ثمودی و لحيانی خطوط یمن کے خطا مسند سے منقول ہیں، اور خط مسند کنعانی رسم الخط سے اسلام کے بعد عربی کا جو کوئی رسم الخط پھیلا وہ بھی مسلمانوں نے ایجاد کیا بلکہ اسلام سے سیکڑوں سال قبل نقش غارہ اور نقش زید کے ذریعہ عربی زبان اور عربی رسم الخط کا پتہ چل چکا ہے، ان کا حوالہ اور نوٹو اسرائیل و فلسطین نے ”تاریخ اللغات السامیہ“ میں دیا ہے، ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ خطوط کوئی خط سے قریبی مشابہت رکھتے ہیں۔

ہندوستان میں شیونخ و سادات کی محدود آبادی کے علاوہ سارے ہندوستانی مسلمان، تسلماً ہندو ہیں، اردو کے بڑے بڑے شعراء ادیب جو ہماری زبان کی تاریخ میں، شیخ، میر، اور مرزا کے نام سے موسوم ہیں، وہ دراصل ہندو ہی تھے، آپ نے شیخ محمد روشن جو شمش کا نام سنا ہوگا، چ عظیم آباد کے رہنے والے تھے، میر حسن کی روایت کے مطابق شمش اس زمانہ میں ایک تذکرہ لکھ رہے تھے، میر حسن کو جو شمش کا حال فدوی کے واسطے سے پہونچا اس نے وہ ان کو ”غوش طینت و نیک اعتقاد، شاعر شیریں کلام، صاحب دیوان“ لکھ جاتے ہیں لیکن ان کا نجی زندگی کے حالات نہیں بیان کرتے، مصحفی نے اپنے ”تذکرہ ہندی گویاں“ میں ایک غلطی تو کی کہ ان کا نام محمد عابد لکھ دیا لیکن ایک بڑے مزہ کی بات لکھ گئے، مصحفی کی روایت کے مطابق جو شمش کے والد ماجد کا نام جسونت ناگر تھا۔

آپ نے میر وزیر علی عبرتی (متوفی ۱۲۰۹ھ) کا نام سنا ہوگا، بہار کی مشہور شخصیت تھی آپ نے وہ تذکرے لکھے معراج الخیال اور ریاض الافکار، معراج الخیال کا قلمی نسخہ مدرسہ سلیمانہ میں اور ریاض الافکار کا قلمی نسخہ خدابخش خاں کی لائبریری میں موجود ہے، شاد نے ان کے حالات لکھے ہیں، ایک اچھے شاعر اور فارسی زبان کے ادیب ہونے کے ساتھ بڑے پایہ کے عروضی بھی تھے، ”حیات فریاد“ (مطبوعہ دارالمصنفین) میں ان کی عروض وانی کا بہت پر لطف واقعہ لکھا ہوا ہے، بہار کے اکثر شعراء جو شمش، فریاد، یکتا، عبرتی، صفیر، قیس (آرومی)، قاضی و جد عروض کے

بڑے ہی سرور آورده شعر اُتھے، اور آج تمنا پھولوار وی اس فن کے ماہر موجود ہیں، مگر افسوس وہ پاکستان ہجرت کر کے چلے گئے، یہی وجہ ہے کہ بہار کے شعرا میں گوزبان کا وہ کوچ نہ پایا جائے جو دہلی اور لکھنؤ کے شعراء میں پایا جاتا ہے، لیکن فنی محاسن کے لحاظ سے شعراء بہار اُردو ادب میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے، چنانچہ اس سلسلہ میں بہار کے مشہور فاضل، محدث اور شاعر مولانا شوق نیوی اور سید ضامن علی جلال لکھنوی کی فنی، ادبی اور لسانی بخشیں قابلِ مبالغہ ہیں، ہاں تو میر ذریعہ علی عبرتی جن کا تیرھویں صدی میں بہار کے شعر و ادب کی تاریخ میں ایک ممتاز مقام ہے خانوادہ سادات سے تعلق نہیں رکھتے تھے بلکہ سری و استو کا بیٹہ تھے۔

اسی طرح مرزا محمد حسین قتیل جن کو غالب نے اپنے خطوط میں طنزاً ”لالہ قتیل“ کہا ہے، مغل نہ تھے بلکہ کھتری قوم سے تعلق رکھتے تھے، اور شیخ محمد اقبال کو تو خود ہی اعتراف ہے کہ:-

توسید ہاشمی کی اولاد میری کف خاک برہمن زاد

قتیل، جوشش، عبرتی، اقبال چونکہ اکابر زمانہ میں سے گزرے اس لئے ان کے متعلق ریسرچ کیا گیا، لیکن اگر وہ بڑے پایہ کے شعرا اور تاریخی ہستیوں میں سے نہ ہوتے تو اُردو زبان کے ان برہمن، کھتری اور کالیستہ شاعروں کو دنیا آج سید، مغل ہی سمجھتی رہتی، اسی طرح کردروں کی تعداد میں آج ہندوستانی مسلمان ہیں، جو اصلاً برہمن، چھتری، کالیستہ ہیں لیکن ان پر سادات و شیوخ، مغل و پٹھان کی نقاب پڑی ہوئی ہے۔ جب حقیقت حال یہ ہو تو کیا ایسے مسلمانوں اور ان کی زبان و تہذیب کو بدیسی کہہ دینا ہندوستان کی جڑ کاٹنا ہے یا اس کے ساتھ محبت کرنا ہے۔ اُردو زبان اور رسم الخط میں ان ہندوؤں کی خدمات بھی کم نہیں جو اصلاً بھی ہندو تھے اور مذہباً بھی ہندو ہے اس سلسلہ میں کشمیری برہمنوں کی بڑی موقر خدمات ہیں، دہلی اور اودھ میں بھی اُردو کے ایسے شعراء کثرت گزرے ہیں، قدیم تذکرہ نگاروں میں میر حسن نے بہت سے ہندو شعراء کے حالات لکھے ہیں، ہمارے عہد میں اور اس سے کچھ قبل پنڈت رتن مانجھ سرشار، پنڈت برج نرائن چکبست، پنڈت دتا تریا کیفی، سر تیج بہادر سپرو، کو اُردو زبان اور اس کا شعر و ادب کیونکر بھلا سکتا ہے، پھر عاقبت اندیش لوگوں کی یہ کوششیں کہاں تک سرانہے کے لائق جو خود ہندو ذہن و قلب کی بہترین پیداواروں کو فنا کے گھاٹ اتارنا چاہتے ہیں۔

تاریخ انقلاب کے لحاظ سے اُردو زبان کی تین منزلیں ہیں پہلی منزل تو وہ تھی جب کہ سماجی ضرورتوں نے اسکی داغ بیل ڈالی، دوسری منزل وہ ہے جبکہ اجنبی لوگوں کے ساتھ مقامی لوگوں کے ربط و اخلاص نے اس کو ترقی دیا۔ یہ زبان پھولی پھولی، اجنبی و مقامی روایات و تہذیب اس کے ذریعہ مزوج ہوئی، تیسری وہ خطرناک سیاسی منزل تھی جبکہ ایک تیسری طاقت نے اپنے مصالح کی بنا پر غیر مسلموں کو اس زبان کے خلاف ابھارا، اور آج جبکہ ملک آزاد بھی ہو گیا، حکومت کو ”غیر مذہبی“ ہونے کا دعویٰ بھی ہے، اُردو زبان اور رسم الخط کو ذبح کیا جا رہا ہے، یہ فریخ

کرنے والے اس کو دیس کی خدمت سمجھ رہے ہیں، حالانکہ ان کو یہ احساس نہیں کہ ملک میں وہ ایک نئے فتنہ کی بنیاد رکھ رہے ہیں، جو یقینی طور پر آگے چل کر ہندوستان کی قومیت، حکومت اور عظمت کے رفیع الشان قصر کی بنیادیں ہلا دیگا۔ اب بھی وقت ہے کہ ہندوستان کے اہل الرائے مسئلہ کی نزاکت کا احساس کریں اور اُردو کو اس کے جایز مقام تک پہنچانے میں ہمدردی و تعاون سے کام لیں، ہندی زبان اگر اُردو سے الگ کوئی زبان سمجھی جاتی ہے، تو پھر اُردو زبان اور اس کے حامیوں کا بھی تو کچھ حق ہے جو تعداد اور اہمیت کے لحاظ سے ہندوستان کا عظیم الشان عنصر ہیں، اور جن کو ناراض اور پست کر کے کبھی بھارت کی ترقی نہیں ہو سکتی قانون بن جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس میں تبدیلیاں کبھی نہیں ہوں گی، پھر کیوں نہیں جلد از جلد اس طرف توجہ کی جائے اور پنڈت سندھ لال کی سرکردگی میں اُردو زبان کے متعلق جو قومی مطالبہ کیا گیا تھا اس کو تسلیم کر لیا جائے۔

۱۹۳۵ء میں سر تیج بہادر سپرو نے ”انجمن بہار ادب لکھنؤ“ کے عظیم الشان جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے کہا تھا کہ ”مسلمان کبھی ہندوؤں کے اس نظریہ کو تسلیم نہ کریں کہ اُردو خاص مسلمانوں کی زبان ہے“ سپرو کی گھڑلو زبان اُردو تھی، ان کی کشمیری برہمن قوم نے اس کی ترقی میں زبردست حصہ لیا، اقبال، سپرو ہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اس لئے انھوں نے ایک تاریخی حقیقت کی بنا پر یہ منحصانہ رائے دی، لیکن آج بجز چند انصاف پسند اور حق پرست ہندوؤں کے ساری ہندو قوم یہاں تک کہ کانگریس کے بڑے بڑے نیتاؤں نے بھی اُردو کا یہ بوجھ صرف مسلمانوں کے دوش ناتواں پر رکھ دیا، اس جبری تفویض کو ہم قبول کرنے سے انکار کر دیتے اگر ملک پر پہلی طرح اجنبی اقتدار ہوتا، لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ملک کے ان حکمرانوں ہی کا یہ فیصلہ ہے، تو گو ہم تاریخ کی اس ”حقیقت“ کو کبھی حقیقت تو تسلیم نہیں کر سکتے کہ ”اُردو خاص مسلمانوں کی زبان ہے“ لیکن اب ہمارا فرض ضرور ہے کہ ہم پہلے سے زیادہ انہماک، ایثار، اور قوت کے ساتھ اس زبان کے استقلال، پھیلاؤ، اور ترقی میں حصہ لیں، ہم پر ایک نئی ذمہ داری عاید کی گئی ہے، اگر ہم نے بے توجہی کی تو ایک زبردست قومی نقصان کریں گے۔ اس لئے اُردو کے بھی خواہوں کا یہ فرض ہونا چاہئے کہ اپنی زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح اپنی معاشی اکتسابات سے اس کے لئے بھی حصہ مقرر کریں اور اُردو انجمنوں، رسائل و اخبارات اور اُردو شاعروں، ادیبوں اور مصنفوں کی سرپرستی کریں۔

مذہب اور فلسفہ مذہب

دونوں معہ محصول دو روپے میں

منیجر نگار لکھنؤ

# اُردو غزل کی ٹکنیک

فن کوئی بھی ہو اس میں ٹکنیک یا تعمیری قاعدے یا رموز سا نچہ ڈھانچہ یا بناوٹ کا گریا بیل بوٹے کے نقشے اسکی نوک پلک کے بھید اس کی گڑھن اس کی صورت گری یا رچاؤ اور نکھار کی ہر درتہ منزلیں ضرور ہوتی ہیں، لیکن غزل کی *Trade Secret* پر باتیں کرنے میں اس کی تفصیل و تشریح میں بحث کے خشک ہو جانے کا یا گتھی کے سلجھانے میں گتھی کے اور اُلجھ جانے کا ڈر بھی ہے۔

جہاں تک اُردو غزل کا تعلق ہے اس کے جنم دن ہی سے اس میں تبدیلی کبھی ترقی اور کبھی تنزل مختلف دوروں میں نظر آتے ہیں غزل کی ٹکنیک یا مسلمہ اور بنیادی قاعدوں میں یہ تبدیلی ترقی و تنزل نہیں ملے گا بلکہ غزل کی روح اور معنویت میں اس کے وجدان اور جمالیاتی تصورات میں تبدیلی ترقی و تنزلی کے سلسلے نظر آتے ہیں۔ غزل کا ہر بڑا شاعر اپنی نغمہ سرائیوں سے ایک ایسی کائنات کی تخلیق کرتا ہے جیسے انگریزی میں *Umar Hayyat* کہتے ہیں۔ یعنی لاثانی یا جسے آپ اپنی مثال کہہ سکتے ہیں۔ مقلد شاعروں کے یہاں کسی بڑے شاعر کی تخلیق کردہ کائنات کی دھندلی اور کمزور پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ ان کی کوئی اپنی کائنات نہیں ہوتی۔

ٹکنیک کے بھی دو حصے ہوئے ایک خارجی اور ایک داخلی، غزل کی ٹکٹری ( *Structure* ) تو بس اتنی ہے کہ کسی بھی بحر یا چند ( *Meter* ) میں پہلا شعر ایک قافیے میں ہو، بعد کے اشعار کا پہلا مصرع قافیے سے آزاد ہو دوسرا مصرع اسی قافیہ میں ہو جس میں پہلے شعر کے دونوں مصرعے ہیں اور عموماً آخری شعر میں شاعر کا تخلص بھی آجائے۔

اب ٹکنیک و ٹکنیک کچھ اور باتیں ہیں۔ یعنی کچھ مسلمہ اشارے یا *Symbols* جیسے سحر اور دی کارواں، منزل، شام غریباں، صبح وطن، گلستان، خار و گل، بہار خزاں، آشتیاں، قفس، ادا، آسماں، قیامت، فصل ساقی، میخانہ، پیما، مئے زلف و سف، نگاہ، گور غریباں، زنداں، کوپڑے محبوب، درجائیاں، بتخانہ، حرم، بنیم، حرم ہستی، نیسی، دامن گریباں، ہوش و بخود، اور عشق مجازی و حقیقی کے واردات و مقامات سے متعلق باتیں۔ غزل کے ہر شعر میں جامعیت *و جامعیت* ہونا چاہئے اور اس کی اپیل عام ہونا چاہئے۔ زندگی کے تجربے جامع اور مکمل بیان کی شکل میں غزل کے اشعار میں پیش کئے جاتے ہیں۔

غزل کا ہر شعر گویا ایک مکمل نظم ہوتا ہے خارجی تسلسل تو بحر قافیہ اور ردیف سے قائم رہتا ہے پھر اسلوب عارضی کی یکسانیت اور کیفیت یا بلاغت یا وجدانی رد عمل کی یکسانیت غزل میں ہم آہنگی پیدا کر کے اسے ایک اکائی بنا دیتی ہیں۔ کچھ غزلیں مفہوم کے لحاظ سے مسلسل ہوتی ہیں۔ کچھ ردیفیں بھی مثلاً آج کل، آج کی رات، ان دنوں، ہنوز، ابھی تک یا ایسے ہی اور بے شمار فقرے اور ٹکڑے غزل میں ایک سبک رو تسلسل پیدا کر دیتے ہیں۔ خارجی تکنیک ہی شاعر کے انفرادی وجدان کے عمل سے داخلی تکنیک بن جاتی ہے۔ مثلاً رند کا شعر تھا جہر انھیں بڑا ناز تھا:-

اگر ٹی کا ہے گماں شک ہے ملا گیری کا رنگ لایا ہے دوپٹا ترا میلا ہو کر  
لیکن صبا کے اس شعر میں جو اب سناؤں گا جذبات کی تکنیک ایسی بدلی ہوئی ہے کہ اسی زمین اور اسی قافیہ میں دنیا بدل گئی ہے۔ صبا کا شعر یہ ہے:-

باغیاں بیل کشتہ کو کفن کیا دیتا پیر ہن گل کا نہ بدلا کبھی میلا ہو کر  
شعر میں کتنی نئی تہیں پڑ گئیں آواز میں کتنے بھنور اور کتنی لہریں پڑ گئیں!۔ وزیر کا شعر ہے:-  
ترجہی نظروں سے نہ دیکھو عاشق دلگیر کو کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو  
غالب کا شعر جو میں اب سناؤں گا اسی بحر میں ہے صرف قافیہ اور ردیف بدلے ہوئے ہیں لیکن وزیر کے شعر میں لکڑی بچنے کی کھٹکھٹا ہٹ سے ترنم کا جو خون ہوا ہے غالب کے شعر میں اس کی ایسی تلافی ہوئی ہے کہ غالب کا شعر سنگیت کی دیوی کی آواز معلوم ہوتا ہے۔ شعر یہ ہے:-

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ نہاں ہو گئیں  
بات یہ ہے کہ خارجی تکنیک کو بھی داخلی تکنیک ہی پیدا کرتا ہے۔ جیسا ساز و یسار آگ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ غزل کے روپ رنگ یا خارجی تکنیک میں نئی جھلک اور نئی جھنکار یعنی تبدیلی و ترقی داخلی تکنیک یا *technique of* سے پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک ہی خیال ایک ہی مفہوم ایک کے دو تکنیک ہو جاتے ہیں مثلاً امیر مینائی کا یہ شعر سنئے:-

جب تک تھے تم کشیدہ دل تھا شکوؤں سے بھرا تم گلے سے گلے سارا گلہ جاتا رہا  
اور فانی کا یہ شعر سنئے جس کا بالکل یہی مفہوم ہے لیکن خیال و مفہوم وہی ہوتے ہوئے جذبات کی دنیا بدل گئی ہے:-  
دل ان کے نہ آنے تک لبریز شکایت تھا، وہ آئے تو اپنی ہی تقصیر نظر آئی  
اور حالی نے تو اسی مضمون و مفہوم کو وہ شرافت نفس بخشی ہے جسے ہم اخلاق جذبات کی آخری منزل کہہ سکتے ہیں۔ حالی کا شعر ہے:-

لتے ہی تم سے بھول گئیں کلفتیں تمام گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا  
سارا گلا جاتا رہا، اپنی ہی تقصیر نظر آئی اور بھول گئیں کلفتیں تمام کے ٹکڑوں پر غور کیجئے۔ فانی اور حالی نے مٹی کو  
پارس بنا دیا ہے یا نہیں پر یہ داخلی تکنیک کی کیمیا ہے۔ ایک ہی واقعہ ایک ہی خیال غم کا خیال ہو جاتا ہے اور خوشی کا  
بھی خیال ہو جاتا ہے۔ مثلاً:-

سربانے میر کے آہستہ بولو ابھی ٹنگ روتے روتے سو گیا ہے  
سودا کے سربانے جو ہوا شور قیامت خدام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے  
ہوگا کسو دیوار کے سائے کے تلے میر کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو  
اس کی دیوار کا سر سے مرے سماں نہ گیا میں تو کبخت یہیں تھا کہیں آیا نہ گیا

میر کے ان دونوں غم آلود اشعار کے بعد آتش کی حوصلہ انگیز آواز سنئے:-

دھوپ میں سایہ دیوار نے سونے نہ دیا خاک پر سنگ دربار نے سونے نہ دیا

کتنا نشاط کارانہ ہے آتش کی آواز اور بات وہی ہے جو میر نے کہی تھی۔

غزل کی خارجی تکنیک میں کوئی اہم تبدیلی یا اہم اضافہ نہ ہو گا نہ ہونے کی ضرورت ہے۔ جیسے انگریزی سائنس میں  
یا انگریزی بلینک درس میں *Galileo* اور *Simon Philip Sydney* کے بعد مارکس، لکسبر  
لٹن، ورڈسورٹھ، شیلی، کیٹس اور ٹینسن نے اپنے اپنے مزاج و وجدان کی نئی تھر تھرا ہٹیں پیدا کر دیں اسی طرح ولی  
دکنی، تمیر، غالب، آتش، امیر اور داغ اور بیسویں صدی کے غزل گو یوں نے غزل کی داخلی تکنیک بدل دی۔ غزل  
کی داخلی تکنیک میں جو تبدیلیاں اقبال کے ہاتھوں رونما ہوئیں وہ انقلاب کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اس سلسلہ میں کچھ حقیقتوں کو سمجھ لینا چاہئے۔ اُردو غزل دور جاگیر داری *Feudal age*

کے انحطاطی زمانہ میں پیدا ہوئی۔ اس کی تمام لطافتیں مجبوری کے محاسن لئے ہوئے تھیں، اگرچہ کبھی کبھی  
جیسے آتش کے یہاں جوشِ عمل کی آب و تاب بھی غزل کے چہرے پر نمایاں ہو جاتی ہے۔ پھر اُردو غزل باوجود  
اپنی ہمہ گیری و آفاقیت کے ایک طبقہ کی شاعری تھی۔

ایک اور بات اُردو غزل میں ایسی تھی جو ہندوستان کے غیر ضمیر کو کھٹکتی تھی اور وہ تھی حیات و کائنات  
سے نا آہنگی۔ اُردو غزل کی عموماً یہ بد توفیقی رہی ہے کہ زندگی کو وہ اس طرح قبول نہیں کرتی تھی جس کی مثالیں  
ہندوستان کے قدیم ادب کے اعلیٰ ترین کارناموں اور روایتوں میں ملتی ہیں۔ میں نے اس کے خلاف چوتھائی صدی  
پہلے آواز اٹھائی تھی مجھے آج یہ کہتے ہوئے اطمینان محسوس ہوتا ہے کہ میری آواز بیکار نہیں گئی اور ادھر کچھ  
برسوں سے اُردو غزل حیات و کائنات کو سینے سے لگاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ دنیا کے عصری کی طہارت کا احساس

نئے غزل گو یوں کو ہو چلا ہے۔ غزل کے مزاج اس کے دل کی دھڑکن اس کے ایمان میں یہ بڑی اہم تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔ غزل کی داخلی تکنیک میں یہ تبدیلی ایک کاپلٹ یا *Reverse Process* کا مرتبہ رکھتی ہے۔ میں نے ابھی بتایا تھا کہ غزل کے میدان میں اقبال کا کام انقلاب کا حکم رکھتا ہے۔ جمہوریت کی روایتوں کو اقبال نے جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا۔ لیکن اقبال کی علمیت یا ترقی پسندی *Ideals* ہے اور وہ *Revivalism* ہے۔ دنیا کی پروتاری قوتوں کا ابھار موجودہ تاریخ کا سب سے اہم باب ہے۔ یہ اتنا اہم باب ہے کہ محض سیاست و معیشت نہیں بلکہ فن و ادب فلسفہ و سائنس تمام علوم اور تمام زندگی کے بنیادی تصوروں کو سرے سے بدل دے۔ اقبال اس انقلاب کی آہٹ نہیں پاسکتے تھے۔ یہ واقعہ یعنی دنیا بھر کے پروتاریوں کی اٹھان *Rise of world of proletarian* تہذیب و تمدن اور ادب سب کو بدل دے گا۔ اُردو نثر کے تمام اصناف پر اس انقلاب کا اثر نمایاں ہو چلا ہے اور اُردو نظم کے تمام اصناف پر بھی جن میں غزل بھی ایک صنف ہے۔ جمہوریت کی جگہ اُردو غزل کی داخلی تکنیک میں جو اجتماعی اور انفرادی علمیت اب آنے والی ہے وہ اقبال کی علمیت سے بالکل الگ چیز ہوگی اس علمیت میں انسانی فلاح و بہبودی و ترقی اور وحدت انسانی کے جو عناصر ہوں گے ان کے مقابلے میں اقبال کی علمیت بڑی غلط چیز معلوم ہوگی۔ بہت کم لوگوں نے اس کا اندازہ لگایا ہے کہ اشتراکی علمیت غزل میں کتنا بڑا انقلاب پیدا کر دے گی اس میں کس قدر بے شمار امکانات پیدا کر دے گی اس میں کتنا زبردست *Challenge* پیدا کر دیگی۔ نئی نرمیاں نئی گرمیاں نئی سختیاں نیا زور نئی زندگی سب کچھ۔ انقلابی تصور غزل میں پیدا کر دے گا۔ غزل ہو یا نظم سب کا موضوع انسان ہے اور انسانی زندگی۔ جب انسانیت اور انسانی زندگی کا نقشہ اور تصور بدل جائے گا تو غزل کی روپ ریکھا بھی بدل جائے گی۔ پُرانے اشارے اور کٹے پڑے الفاظ نئے معنی دینے لگیں گے نئے اشارے *Symbols* مثلاً مزدور، ہنسپا، ہتھوڑا، ٹریکٹر، انجن اور طرح طرح کی مشینیں اور ایجادیں اور علمی زندگی کے ہزار پہلوئی جھلک دینے لگیں گے۔ قدرت پر فتح حاصل کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہوئی انسانیت غزل کی داخلی تکنیک میں کاپلٹ کر دے گی۔ طبقاتی زندگی سے جیسے تہذیب و تمدن آزاد ہو جائیں گے اسی طرح غزل بھی تمام انسانی زندگی کا جس میں سب سے بڑا حصہ مزدوروں کا ہے ترجمانی کرے گی۔

ایک اور بات کی طرف اشارہ کر کے میں رخصت چاہوں گا۔ انقلابی غزل میں ایک سراپن ہرگز نہیں ہوگا شاعر کی انفرادیت کو اجاگر ہونے کا جیسا موقعہ انقلابی غزل دے گی وہ اب تک کی غزل کوئی ایسے نہیں دے سکی ہے۔ غزل چونکہ بقول پروفیسر مجنوں بہت کثر صنف سخن ہے اس لئے جس انقلابی تبدیلی کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے

وہ غزل میں ابھی بہت رک رک کر آتی ہے لیکن اُردو نظم میں یہ تبدیلی صاف دیکھی جاسکتی ہے۔ آج کی اُردو نظم یعنی انقلابی اُردو نظم میں شاعر کی انفرادیت جتنی درخشاں ہے کسی اور دور کی اُردو نظم میں انفرادیت کا ایسا تنوع نظر نہیں آتا۔ آگے چل کر ٹھیک یہی بات یہی تنوع یہی رنگارنگی اُردو غزل میں بھی نظر آئے گی اس اُردو غزل میں جو تربیت یافتہ مزدوروں کے لئے لکھی جائے گی نہ مفت خوروں اور منافع خوروں کے لئے۔ واضح رہے کہ بہت بند ہوگی وہ غزل۔ لیکن نئے دور میں بھی ہم حافظ و سعدی و کالیداس، میر و غالب کے فنموں میں جو بڑی قدریں زندگی کی ہیں ان کو سراہیں گے اور ان سے سبق لیں گے۔

جو خود مردہ ہیں وہ مردوں کے وارث بن نہیں سکتے  
کہ اس دنیا میں ناموس کہن کے پاسباں ہم ہیں

فراق گورکھپوری

(نشر گاہ لکھنؤ)

## پرسٹو

نومبر کی ایک نہایت خنک صبح کو گریٹر، ادا با ہوٹل کی غلام گردش میں بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اسکے پاس صرف پانچ سنٹ تھے اور ہوٹل کے مالک نے کہہ دیا تھا کہ جب تک وہ پورا کرایہ ادا نہ کر دے۔ اپنے کمرہ میں نہیں جاسکتا۔ اس کا تمام سامان یہاں تک کہ اور کوٹ بھی کمرہ ہی کے اندر بند تھا۔

یہ ٹہلتا ہوا کھڑکی کے پاس گیا تو اس نے دیکھا کہ شیشہ سرد بخارات اکٹھا ہو جانے کی وجہ سے دھندلا تھا اور باہر کوئی چیز نظر نہ آتی تھی۔ اس کو ایک جرمن سائنس دان کا یہ قول یاد آیا کہ اگر گلیسرین کا صابن شیشہ پر رگڑ کر کپڑے سے صاف کر دیا جائے تو بخارات جمع نہیں ہو سکتے۔

یہ فوراً قریب کی ایک دوکان سے پانچ سنٹ کا ایک گلیسرین صابن لے آیا اور اس کے ۲۴ برابر کے ٹکڑے کر کے قریب کے گیس اسٹیشن پر گیا اور وہاں اس کا تجربہ کرا کے ۱۵ سنٹ میں فروخت کر آیا۔ اس سے اس سے اس نے پھر صابن خریدا اور دوسرے گیس اسٹیشنوں پر پہنچا، یہاں تک کہ شام تک اس نے ۲۴ ڈالر کمائے۔

تین مہینے کے بعد جب وہ ڈیڑھ لاکھ اپنے وطن واپس آیا تو اس کے پاس ایک ہزار ڈالر تھے اور اس سے اس نے ایک کارخانہ ”پرسٹوپروڈکٹس کمپنی“ کے نام سے قائم کیا جو آج کل ہر قسم کی پالش کرنے والی چیزیں تیار کرتا ہے اور ہزاروں ڈالر روز پیدا کر رہا ہے۔

# مشرق وسطیٰ میں سرمایہ کاری اور اشتراکیت کی کشمکش

آج کل مشرق وسطیٰ کا حصہ بڑی دلچسپ سیاسی جولانگہ بنا ہوا ہے۔ ایک طرف برطانیہ و امریکہ اپنا رسوخ و درخور بڑھاتے جا رہے ہیں اور دوسری طرف روس نے سرمایہ دار ملکوں کے خلاف امن پسندی کی تحریک یہاں کے لوگوں میں پیدا کر دی ہے۔ مشرق وسطیٰ عبارت ہے جزیرہ نمائے عرب کی ان حکومتوں سے جو یونٹو کوئی اہمیت نہیں رکھتیں، لیکن جغرافیائی پوزیشن اور پٹرول کی معدنیات کی وجہ سے اس کو اتنی اہمیت حاصل ہے کہ آئندہ جنگ میں اسی فریق کو کامیابی ہو سکتی ہے جس کا اثر و اقتدار یہاں قائم ہو۔ اور اسی لئے روس و امریکہ دونوں طرف سے یہ جدوجہد جاری ہے۔

روس نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح یہاں کا پٹرول حاصل کرنے کے لئے اپنے قدم جماسکے، لیکن جب امریکہ کے مقابلہ میں کامیابی نہ ہوئی تو اس نے یہ پردہ پاگندہ شروع کیا کہ سرمایہ دار حکومتیں مشرق وسطیٰ کو لڑائی کی آگ میں جھونک دینا چاہتے ہیں حالانکہ ان کا مفاد صرف قیام امن و سکون میں ہے۔ چونکہ امن و سکون کی آواز فطرتاً قابل قبول ہوتی ہے اس لئے عربستان کے قریب قریب تمام ملکوں میں اشتراکی تحریکیں ابھرنے لگی ہیں۔

روس کی یہ تحریک وہاں غالباً زیادہ کامیاب نہ ہوتی، لیکن چونکہ وہاں کی آبادی اب یہ بھی محسوس کر چکی ہے کہ امریکہ کا اثر و اقتدار سلطان کی طرح پھیل کر وہاں کے تمام اقتصادی عروق پر چھایا جا رہا ہے، اس لئے سرمایہ دارانہ حکومتوں کے خلاف وہاں کافی شورش پیدا ہو چکی ہے، اور حکومتوں کو ان کے دبانے میں بہت دشواریاں پیش آرہی ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے امریکہ کے اثر و اقتدار کی داستان سنئے۔

عرب ملکوں میں اس وقت جتنا پٹرول نکلتا ہے اس کا ۵۰ فی صدی امریکہ کی ملکیت ہے، لیکن وہ اس پر بھی قناعت کرنا نہیں چاہتا اور کوشش کر رہا ہے کہ مزید مراعات اسے حاصل ہو جائیں۔ سعودی عرب کے چشموں سے امریکہ کو جتنا پٹرول مل رہا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ امریکن پٹرول کمپنی کو جو امریکہ کے صرف چھ سو سرمایہ داروں کی ملکیت ہے، پچھلے ۵ سال میں ۲۵ کروڑ ڈالر کا فائدہ ہوا ہے اور عرب مزدوروں کو جن کی محنت کی بدولت کے یہ انہار سمیٹ رہا ہے، ۵۰ فی صدی سے زیادہ مزدوری نہیں ملتی اور ان کی غربت و افلاس کا وہی عالم

جو پہلے تھا۔ اسی کے ساتھ امریکہ اپنی استعماری پالیسی کو بھی یہاں فروغ دینا چاہتا ہے اور مستقبل قریب میں تمام مشرق وسطیٰ کا تنہا مالک بن جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ چنانچہ پٹرول کمپنی کی حفاظت کے بہانہ سے اس نے پولیس کی بڑی زیر دست جماعت وہاں متعین کر رکھی ہے اور مختلف مقامات پر ہوائی اڈے بنا رہا ہے۔ وہ خلیج فارس اور بحر روم میں اپنے بندرگاہ بھی بنانے جا رہا ہے اور ٹھیک اسی وقت جبکہ مصر، سوڈان، عراق، فلسطین اور شرق اردن کی حکومتیں برطانوی اثر سے آزاد ہونے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی ہیں، امریکہ نہ صرف سعودی امریکہ میں مضبوط فوجی اڈے بنانا جا رہا ہے۔ بلکہ لیبیا (افریقہ) میں بھی بری بحری اور ہوائی استحکامات کا انتظام کر رہا ہے تاکہ طرابلس کا علاقہ آزاد نہ ہونے پائے۔

فلسطین میں اس کی پالیسی یہ ہے کہ وہاں نہ کوئی آزاد عرب حکومت قائم ہو سکے، نہ اسرائیلی حکومت۔ بیت المقدس کو بین الاقوامی اثر کے تحت لانے کی بھی مخالفت وہ اسی لئے کر رہا ہے۔ وہ اسرائیلی حکومت اپنی کالونی بنانا چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ فلسطین اور بیت المقدس کو شرق اردن اور اسرائیلی حکومت میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ ایک جگہ اس کا اثر رہے اور دوسری جگہ برطانیہ کا۔

پھر اس کی یہ پالیسی صرف فلسطین ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ تمام مشرق ادنیٰ کو وہ اپنی کالونی بنالینا چاہتا ہے اور ترکی، سعودی عرب اور فلسطین پر اپنا اقتدار قائم کرنے کی فکر میں ہے۔ یہاں تک کہ شام و عراق میں بھی جو برطانیہ کے زیر اثر ہیں وہ ریشہ دوانیاں کر رہا ہے، ان کے علاوہ دوسرے عرب ممالک پر بھی جو برطانیہ کے فوجی و سیاسی اثر میں ہیں، امریکہ کا دانت ہے۔ چنانچہ مصر میں وہ اپنی مصنوعات بہ کثرت بھیج رہا ہے تاکہ اسے اپنا مارکیٹ بنائے۔ سوئز کے علاقہ میں وہ اپنا اثر قائم کرنے کے لئے مصر سے ایک ثقافتی معاہدہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور اس سلسلہ میں وہ اپنے فوجی و سول مشیر وہاں بھیج رہا ہے تاکہ مصر میں اثرات بڑھانے کے امکانات پر غور کرے۔ امریکہ نے عراق کو بھی مجبور کیا ہے کہ وہ آبپاشی کے لئے نہریں بنانے کے لئے امریکین بین الاقوامی سے قرض لے تاکہ امریکہ یہاں وسیع پیمانہ پر زراعت و فلاحیت کا کام کرے۔ شرق اردن پر بھی یہی زور ڈالا جا رہا ہے۔

بہر حال امریکہ انتہائی کوشش کر رہا ہے کہ مصر، عراق، شرق اردن اور فلسطین کی عرب حکومت کی سیاست و اقتصاد کو اپنے ہاتھ میں لے لے، لیکن اسی کے ساتھ وہ برطانیہ کے زیر اثر علاقوں میں برطانوی اثرات کے قیام کی بھی کوشش کر رہا ہے۔ چنانچہ مصر کے مسئلہ میں وہ زور دے رہا ہے کہ وادی نیل میں برطانیہ کا فوجی اقتدار قائم رہے، اسی طرح یمن اور عربی فلسطین میں بھی وہ برطانوی اثرات کے حق میں ہے، اس کا سبب ایک تو یہ ہے کہ جو علاقے برطانوی اثر میں ہیں ان میں امریکہ اپنی استعماری پالیسی کو زیادہ آسانی سے کامیاب بنا سکے گا اور دوسرے یہ کہ عرب ملکوں کو غلام بنائے رکھنے میں اسے اور زیادہ آسانی پیدا ہو جائے گی۔

اب دوسرا رخ ملاحظہ کیجئے اور وہ یہ ہے کہ مشرق وسطیٰ کی آبادی امریکہ کی اس استعماری پالیسی کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتی اور وہ سمجھتی ہے کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سارا عربستان امریکہ کا غلام ہو جائے گا اور آئندہ جنگ کی آگ میں اس کی تباہی لازم ہے۔ اس لئے روس کی اشتراکی تحریک کے زیر اثر وہاں ہر جگہ امن پسندی کی ادھول آزادی کی تحریک وسیع ہوتی جا رہی ہے۔ اس کا رد عمل وہاں کی حکومتوں پر امریکہ کے زیر اثر یہ ہوا ہے کہ کمیونسٹ جماعتوں کو پکڑ پکڑ کر مقید کیا جا رہا ہے اور ان کے خاص خاص افراد کو پھانسی دی جا رہی ہے، لیکن باوجود اس کے یہ تحریک وہاں قوی ہوتی جا رہی ہے۔ چنانچہ لبنان کی صلح کمیٹی میں وہاں کے مزدور، عمال، نوجوان طبقہ، تجارتی یونین وغیرہ سب شامل ہوتے جا رہے ہیں۔ یہی جوش شام اور اسرائیلی حکومت میں بھی پایا جاتا ہے۔

تیسرے سوڈان کی پہلک کا یہ مطالبہ کہ برطانوی فوجیں یہاں سے ہٹالی جائیں برابر جاری ہے۔ اور مصر و برطانیہ کے معاہدہ کی سخت مخالفت کی جا رہی ہے۔ باوجود سخت سنسر کے مصری اخبارات میں امریکہ کی استعماری پالیسی پر سخت نکتہ چینی ہو رہی ہے۔

۱۶ جنوری کو طرابلس میں امریکہ و لبنان کے معاہدہ کے خلاف طلبہ، مزارعین اور مزدوروں نے بڑا زبردست مظاہرہ کیا۔ ۱۷- اور ۱۹ جنوری کو ۵ ہزار کی جماعت نے بیروت میں بھی اسی قسم کا مظاہرہ کیا۔ ۲۳ اور ۲۴ جنوری کو شام میں بھی صلح کمیٹی کی طرف سے احتجاجی جلوس نکالے گئے۔ اسرائیلی حکومت میں یہی ہنگامہ برپا ہے۔ الغرض جس حد تک کاشتکاروں، مزدوروں اور عام پہلک کا تعلق ہے، روس کی طرف میلانات بڑھتے جا رہے ہیں اور امریکہ کی استعماری کے خلاف جذبات زیادہ شدید ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن امریکہ و برطانیہ کی کوششیں بھی اپنی جگہ برابر جاری ہیں۔ تمام اہم مقامات پر فوجی اڈے بنائے جا رہے ہیں، فوجی نقطہ نظر سے ہوائی جہازوں اور فوجوں کے اڈے بنانے کے لئے نئے طیارے ہو رہے ہیں اور یہاں کی پٹرولی پیداوار پر پورا تسلط قائم کیا جا رہا ہے۔

## بال عمر بھر کے لئے سیاہ نکلیں گے

**روح حیات** میں نے بعد تجربات اور کثیر روپیہ خرچ کرنے کے بعد یہ ایسی نادر دوا ایجاد کی ہے جس سے کھنکھانے سے عمر بھر کے لئے تمام بال سیاہ نکلیں، خداوند عالم نے جڑی بوٹیوں میں عجیب غریب اثرات پیدا کئے ہیں، جالینوس، لقمان وغیرہ نے اپنی دو دو ہزار برس کی عمر میں تجربہ ہی کرتے میں صحت کی تحقیر۔ قیمت دس روپیہ (عقلمند)۔

**اکسیر برص** جسم میں سفید داغ ہو گئے ہوں اور کیسا ہی بے مرض پرانے سے بڑا ہو گیا ہو اور داغ خواہ کتنے ہی بڑے ہوں قطعی اس دوا سے تھوڑے عرصے میں صحت کاملہ ہو جاتی ہے اور پھر کبھی بے مرض نہیں ابھرتا ہے نہایت اکسیر دوا ہے ضرور استعمال کریں، ہاتھ شکن کو آرسی کیا ہے تجو خود شہر ہو جائے گا۔ قیمت تین روپیہ (ستے)۔

(نوٹ) قلمی دوا نہ ہو تو قیمت داپس، میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر لکھتا ہوں کہ یہ دوا میں نہایت مجرب ہیں میرا پیشہ خلق خدا کو نفع پہنچانے کا ہے عام مشہور کی طرح لوٹنے کا نہیں ہے، اب بھی اگر آپ محروم رہیں تو یہ آپ کی قسمت ہے۔

حکیم ثابت علی (رئیس نچرمان، خوش کلام مثنوی مولانا روم صاحب)

پتہ ۱۔ محمود نگر لکھنؤ (یو۔ پی۔)

# غائب کے ایک خط کا انکشاف

غائب کی آخری زندگی میں لوگوں کو ان کے خطوط کی اشاعت کا خیال پیدا ہوا اور دو مجموعے مرتب بھی ہوئے۔ عود ہندی چھپی ہوئی شکل میں ان کی نظر سے بھی گزری "اردوئے معلیٰ" کے چھپ جانے کی خبر بھی بستر بیماری پر ان کے گوش زد ہوئی لیکن بد قسمتی سے مرزا اپنی زندگی میں اسکی مقبولیت کا اندازہ نہ کر سکے اور شاید انھیں یہ بھی نہ معلوم ہو سکا کہ ان کی یہ کتاب ان کے منشاء کے مطابق بہت زیادہ غنیمت چھپی، ان دونوں مجموعوں کے علاوہ بھی ان کے کچھ خطوط لاہور گورنمنٹ نے نصاب کے لئے تجویز کئے تھے۔ ان خطوں کی تعداد اگرچہ بہت کم ہے لیکن بہت کم ہے لیکن مرزا کے خاص رنگ سے آشنا کرنے کے لئے یقیناً کافی ہیں ان خطوں میں سے میر ہمدی مجروح کے نام کے خط اردوئے معلیٰ میں کسی قدر کمی زیادتی کے ساتھ موجود ہیں لیکن اصلی حالت میں ہمیشہ پر شاد صاحب کے مجموعہ میں ڈاکٹر عبدالستار صاحب نے شایع کئے ہیں، مجھے حال ہی میں ایک نہایت اہم اور تاریخی خط ملا ہے یہ خطاب تک کسی مجموعے میں نہیں دیکھا گیا اس خط میں مرزا نے خلعت یابی کی تاریخ اور اپنی ضعیفی اور قدر دانی حکام کا تذکرہ کیا ہے۔

یہ خط منشی نو لکشور کے نام ہے جو اودھ اخبار ۲۵ مارچ ۱۸۶۳ء میں صفحہ ۲۱ پر شایع ہوا ہے۔

## خط

منشی صاحب تمیل المناقب جناب منشی نو لکشور صاحب کو دولت دار قبائل و جاہ و جلال روز افزوں نصیب ہو۔ چونکہ احباب کا سیلابی و شاد کامی احباب سے شاد ہوتے ہیں اس واسطے مجھے ان دنوں میں یوری اقبال سے ایک امر خوشی کا پیش کیا ہے تو آپ کی خوشی کے واسطے آپ کو لکھتا ہوں بلکہ نظر حمد گر کے اتحاد پر تم کو تہنیت دیتا ہوں آپ کو مبارک ہو، کہ آفرامہ گزشتہ کو جو حضرت نلک رفعت نواب معلیٰ الالاقاب جناب لفٹنٹ گورنر بہادر قلم و پنجاب میں تھے میں تشریف لائے تو رشتہ کے دن ۳ مارچ ۱۸۶۳ء حال کو اس گمنام گوشہ نشین کو یاد فرمایا اور ازراہ ہندہ پروری کمال عنایت سے خلعت عطا کیا۔ بسمان اللہ جو لوگ متعلق ہیں لفٹنٹ گورنر پنجاب سے وہ قسمتوں کے کئے اچھے ہیں جناب نواب معلیٰ الالاقاب کے مکارم اخلاق وہ روح فزا کہ جس سے مردہ زندہ ہو جائے صاحب والا مناقب تامل و گلشن نور سائیں صاحب بہادر سکرتز کے کلمات شفقت آمیز وہ روان آسا کہ جس کو سن کر بیمار شفا پائے۔ میں۔۔۔۔۔ (کرم خوردہ)۔۔۔۔۔ شادمان آملہ بڑھا گیا و اللہ تعالیٰ ہے۔

وزیر چینی شہر یارے چناں ۶ جہاں چوں نگیر و فرارے چناں

..... (کرم خوردہ) ..... لفتنٹ گورنر بہاؤ اور صاحب سکریٹری بہاؤ کا کیا کہنا ہے۔۔۔۔۔ (کرم خوردہ) .....  
 ..... آفتاب و ماہتاب میں مگر پنڈت من پھول سنگھ صاحب منشی بھی دیانت و امانت و  
 کار پر دازی و مظلوم نوازی میں انتخاب ہیں یہ نہ مبالغہ ہے نہ خوشامد ہے، بیان واقعی ہے شاعرانہ سخن سازی کو میں نے  
 دخل نہیں دیا، وہ لکھا ہے جو سچ اور واجب ہے۔ فقط

دوام دولت سرکار انگریزی کا طالب رجور ناتواں اسد اللہ خاں غائب

یہ تو نہیں معلوم ہو سکا کہ منشی صاحب اور مرزا سے دوستی کیونکر ہوئی لیکن اتنا معلوم ہے کہ ان کے تصانیف کی  
 اشاعت منشی صاحب نے بہت اہتمام سے کی، اور اس کا اشتہار بھی اچھے طریقے سے دیا جس میں مرزا کا نام اور ان کے  
 صفات بھی ضرور ہوتے تھے۔

منشی صاحب ستمبر کی آخری یا دسمبر کی ابتدائی تاریخوں میں دہلی گئے تھے، اس سفر میں وہ دہلی کے تمام امرا و اکابر  
 سے ملے مرزا نے علاؤ الدین خاں کو لکھا ہے۔

”شفیق کرم و لطف مجسم منشی نزل کشور صاحب بسبیل ڈاک یہاں آئے، مجھ سے اور تمہارے چچا اور تمہارے بھائی

شہاب الدین احمد خاں سے ملے۔۔۔۔۔ پنجشنبہ ۱۲ جمادی الثانی سال ۱۲۸۵ھ (مطابق ۲ دسمبر ۱۸۶۳ء)

پھر ۱۳ دسمبر کو خط لکھا: خط بھی ۱۸۶۳ء کا۔

اودھ اخبار ۲۳ دسمبر ۱۸۶۳ء میں منشی صاحب نے دہلی کے جن لوگوں سے ملاقات کی ان کی فہرست شایع  
 کی لیکن مرزا سے ملنے کا دن اور تاریخ یا مزید کوئی تفصیل نہیں بتائی، ”شہاب الدین خاں“ سے ملاقات کا ذکر بھی ہے  
 لیکن یہ نہیں معلوم کہ کہاں، مرزا نے ایک ملاقات کا ذکر کیا ہے:-

”ایک دن منشی صاحب میرے پاس بیٹھے تھے اور برزخوردار شہاب الدین خاں بھی تھا، میں نے شاقب کو مخاطب کر کے کہا کہ

اگر میں دنیا دار ہوتا تو اس کو نوکری کہتا، مگر چونکہ فقیر تکیہ دار ہوں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ تین جگہ کا روزینہ دار ہوں ساڑھے باٹھ

روپے یعنی لما صے سال سرکار انگریزی سے پاتا ہوں اور بارہ سو سال رامپور سے، اور چوبیس روپیہ سال ان مہاراج

سے۔ تو فیصیح کہ دو برس سے ہر مہینہ میں چار بار اخبار مجھ کو پہنچتے ہیں قیمت نہیں لیتے مگر ان اڑتالیس ٹکٹ مطبع میں پہنچا

دیا کرتا ہوں۔“ اُردو سے معنی مجیدی صفحہ ۳۲۴

اودھ اخبار کا تذکرہ (کلیات نشر طبع ثانی صفحہ ۲۵۳) مرزا نے ایک جگہ اور کہا ہے، منشی صاحب کو لکھتے ہیں:-

”رسیدن اودھ اخبار ازاں سو در ہر ماہ چہار بار و رسیدن نر ازین سو در ہر سال دو بار اگر منظور دارند منظور است“۔ ۱۸ جولائی ۱۸۶۰ء

ان تمام چیزوں کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ منشی جی پہلے پہل ۱۸۶۳ء میں مرزا غالب سے ملے، اگرچہ ان سے غائبانہ تعارف ۱۸۶۱ء سے تھا، معلوم نہیں غلام رسول صاحب نے کس دلیل کی بنا پر پہلی ملاقات ۱۸۶۳ء میں بنائی ہے۔ اسی سلسلہ میں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ نوکشاوریس میں سب سے پہلے تصانیف غالب میں ”قاطع برمان“ ۱۸۶۲ء میں چھپی ہے، کلیات کا اشتہار بھی اسی سال سے شروع ہوا، اور ۳ جون ۱۸۶۳ء کو یہ اعلان ہوا کہ۔

”بوجہ عدم طیاری تصویر جناب مرزا صاحب موصوف کلیات بخدمت شائقان تقسیم ہوا ملتوی تھا اب طیار ہو گئی۔“

منشی جی بھی غالب کی بڑی عزت کرتے تھے۔ چنانچہ مرزا غالب کا مذکورہ بالا خط کو پڑھ کر انھوں نے اپنے تاثرات اخبار میں اس طرح ظاہر کئے تھے۔

”بخدمت ہر زمانے میں کامیاب ہوتے ہیں اہل جوہر تعظیم و توقیر کو انتخاب ہوتے ہیں، دیکھئے ان دنوں میں سرکار نے کیسی مہربانی کی، کمال قدردانی کی، نواب لفٹنٹ گورنر بہادر نے مرزا اسد اللہ خاں غالب کو خلعت فاخرہ عطا فرمایا، اور رئیس نوازی کی نظر سے بدل التفات کر کے ہم چشموں کو ان کا اعزاز و اکرام دکھایا، زیادہ کیا احتیاج بیان ہے، ان کے خط سے یہ حال عیاں ہے“۔ اودھ اخبار ۲۵ مارچ ۱۸۶۳ء

اسی طرح ان کے انتقال کے بعد منشی نوکشاوری تقریباً سال بھر تک مسلسل تاریخیں اور مرثیے شائع کرتے رہے، ہر گز پال نرائن لکھنؤ کا مرثیہ صفحہ ۱۰۳۲ سے شروع ہو کر صفحہ ۱۰۳۵ پر ختم ہوتا ہے۔

**مرثیہ احسین**

لے اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۶۰ء سے ”مرزا“ اودھ اخبار کے خریدار ہوئے۔ ۱۸۶۱ء سے، ۲۵ غالب صفحہ ۴۱۶۔

## ترغیبات حبشی یا شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی، نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا ادیشن

قیمت چار روپیہ (دو روپیہ علاوہ محصول)

منیجر نگار لکھنؤ

# انیس کی مرثیہ نگاری

اور

”فاروقی صاحب کی ستم ظریفی“

(سلسلہ ماضی)

فاروقی صاحب کا یہ بھی ادعا ہے کہ انیس نے اہلبیت رسول کی جو ذہنیت دکھائی ہے بالکل اسلام کے خلاف ہے استغفر اللہ، زینب کا کیر کڑ اسلام کے سوا کون ایسا پر عظمت و جلال بنا سکتا تھا؟ غالباً اُن کی مراد ہے کہ بعض مواقع پر عرب عورت کے بجائے ہندوستانی عورت کے جذبات دکھائے ہیں مثلاً روتے روتے پہوش ہو جانا، ہونٹوں سے پان کی لالی غائب ہو جانا اور ایسی ہی دوسری باتیں۔ انیس ایسے مواقع پر واقعات بیان نہیں کرتے بلکہ واقعات گڑبگڑ کر اُن کے پردے میں جذبات کی مصوری کرتے ہیں اور ایسی مصوری سامعین کو متاثر نہیں کر سکتی جب تک اُن کا اظہار اس اسلوب سے نہ ہو کہ سامعین کے دلوں کے تار چھڑے۔ پروفیسر محی الدین زور قادری کے الفاظ میں:-

”میر انیس اگر ہندوستانیوں کی نظروں کے آگے ایک عرب عورت کا مکمل نقشہ کھینچ دیتے تو ان کے کلام کو اس قدر مقبولیت

حاصل نہ ہوتی کیونکہ ہندوستانی اُن کی پیش کردہ ہستیوں کو اپنی چیز نہ سمجھ کر اُن سے غیرت برتتے اور یہ مغائرت اُنھیں اُن

بھر دیوں اور اُس پر خلوص محبت سے روکے رہتی جو آج میر انیس کے پڑھنے کے بعد حضرات زہرا، حضرت زینب وغیرہ کے

متعلق دلوں میں خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔۔۔ اس لئے میر انیس نے جن انسانی سیرتوں کو پیش کیا ہے اُن میں ایک حد میں تک

ہندوستانی فطرت کو بھی شامل کر لیا ہے“ (تنقیدی مقالات صفحہ ۲۹۴-۲۹۵)

فاروقی صاحب نے فلسفہ و ادب کے باہمی تعلق پر بھی ایک مختصر بحث کی ہے اس کی اُٹھان اچھی تھی لیکن نتیجے تک پہنچنے پہنچنے بہک گئے اور یہ حکم نافذ کر دیا کہ:-

”فلسفی شاعر تمام کائنات کی بابت ہمیں نئے خیالات دیتا ہے۔“

لے اسلام نہیں بلکہ عرب کیر کڑ کے خلاف ہے۔ (نیاز) — (۲) فاروقی صاحب نے بھی یہی کہا ہے کہ سامعین کے جذبات ترجمہ کو اُبھارنے

کے لئے انیس نے یہ رنگ اختیار کیا اس لئے مرثیہ میں درد انگیزی تو ضرور پیدا ہو گئی لیکن بندی جاتی رہی۔ (نیاز)

تمام کائنات کی بابت نئے خیالات دینے والے کسی فلسفی شاعر کا مجھے علم نہیں اور فاروقی صاحب نے کسی ایک شخص کا بھی نام پیش نہیں کیا کہ غور کرنے کا موقع ملتا۔ علاوہ برائیں ایسے خیالات یا اخذ کردہ نتائج سائنس مہیا کرتا ہے نہ کہ فلسفہ یا شعر جن میں حالات و واقعات کا وجود مان کر یا فرض کر کے اُن کی توجیہ یا تعمیر کی جاتی ہے۔ ان کا دائرہ عمل کل کائنات پر محیط بھی نہیں ہوتا بلکہ مخصوص اشیاء یا مسائل تک محدود رہتا ہے۔ البتہ سائنس چھان بین اور تجربات میں لگا رہتا ہے اور ایسی چیزوں، قوتوں یا قوانین کا انکشاف کرتا ہے جن کا اُس سے پیشتر ہمیں علم نہ تھا یا اُس حد تک علم نہ تھا۔

بات یہ ہے (جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں) کہ شاعری میں حقائق اشیاء پر غور و فکر یا تفلسف کا منشا اس کے سوا کچھ نہیں کہ مسائل حیات و فطرت کی تخیلی یا جذباتی تفسیر یا ترجمانی کی جائے۔ افادہ ادب یا ایسا ادب جس میں شاعر عمدہ کوئی فلسفیانہ موضوع منتخب کر کے اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے میری بحث سے خارج ہے۔ اب اسے انیس کی بدقسمتی کے سوا کیا کہے کہ فاروقی صاحب اُس کے عہد میں نہ ہوئے تاکہ مشفقانہ مشورہ دیتے کہ امام کے ایثار کو ایک عظیم الشان فلسفہ کی صورت میں نظم کیجئے یا ایسی کوئی نظم کہئے کہ سننے والوں پر مفکرانہ سنجیدگی طاری ہو کہیں تک رقت اور مصائب کے نقشے پیش کئے جائیگا انیس کی حالت کے زیادہ عرصہ نہیں ہوا فاروقی صاحب، ڈنکے کے ہم عصر ہوتے تو اُسے تنبیہ کرتے کہ کہاں "سیر دوزخ" میں وقت ضائع کر رہا ہے مزدور پر کوئی شاہکار لکھ!

میں البتہ فاروقی صاحب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے میرے اس مقطع کی تاویل کر دی۔

دنیا عجب آئینہ ہے، آئینے میں دنیا خود اپنی ہی تماشال اثر ڈھونڈ رہی ہے!

اس کے بعد فاروقی صاحب نے مذہب کے تین پہلوؤں یعنی فقہی اور رسمی لے کر یہ دکھانا چاہا ہے کہ میر انیس نے مذہب کے صرف رسمی پہلو کو پیش کیا ہے اور صرف ایسے مذہبی عقاید کو لیا ہے جو عمومی فہریت کے لئے تسکین بخش ہوں۔ اول تو یہ اہتمام بے بنیاد ہے اور بالفرض ایسا ہے بھی تو میر انیس کی شاعری پر حزن نہیں آتا وہ ایک لکھ رہے تھے نئی "بنیاد اعتقاد" کی تالیف میں منہمک نہیں تھے پھر مخصوص طور پر اس مرثیہ (جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے) کی مٹی ان الفاظ میں پلید کی ہے۔

یہ مرثیہ یوں شروع ہوتا ہے کہ عاشور کی صبح ہے (وحسین فریضہ سحری کی ترفیب (دعوت؟) دے رہے ہیں۔ اس کے بعد

انصاروں (انصار؟) کی حالت کا بیان ہے، پھر صبح کی تعریف میں چند بند آتے ہیں جن کا مذہبی جذبات یا خیالات سے

کوئی تعلق نہیں ہے۔

کاش فاروقی صاحب میں اُس لطیف ربط اور اُس ناز کی عظمت سمجھنے کی استعداد ہوتی جس نے دنیا ہی میں ان عازمان شہادت کے لئے دشت کو مینو ہوا اور چرند و پرند و خجرو جبر سب کو ان کا مقتدی بنا دیا تھا۔ یہاں صرف دو بند نقل کئے جاتے ہیں:-

وہ قمریوں کا چار طرف سرو کے ہجوم کو کوکا شور، نعرۂ حق سرو کی دھوم  
سبحان رہنا کی صدا تھی علی العموم جاری تھے وہ جو ان کی عبادت کے تھے رسوم

کچھ گل فقط نہ کرتے تھے رب علا کی مدح

ہر خار کو بھی نوک زباں تھی خدا کی مدح

چیونٹی بھی ہاتھ اٹھا کے یہ کہتی تھی بار بار اسے داند کش ضعیفوں کے رازق ترے نثار

یا حی یا قدير کی تھی ہر طرف پکار، تسبیح تھی کہیں، کہیں تہلیل کرو گار

طائر ہوا میں مست، بہر سبزہ زار میں

جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

تاہم فاروقی صاحب کس ڈھٹائی سے فرماتے ہیں کہ صبح کی تعریف میں کچھ بند آتے ہیں جن کا مذہبی جذبات یا خیالات سے کوئی  
تعلق نہیں ہے۔ اور ایسی نماز کے متعلق جس کا اقتدار کل کائنات کر رہی ہے ارشاد ہوتا ہے کہ پھر نماز کا بیان آتا ہے اور  
اس میں تا متر زور اذان اور نماز کے خارجی پہلوؤں پر ہے۔ ان اشعار:

زینب کی یہ دعا ہو کہ اے رب ذوالجلال بچ جائے اس فساد سے خیر النساء کالال

بانو نیکنام کی کھیتی ہری رہے

صندل سے مانگ بچوں سے گود ہی بھری رہے

کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس قسم کی دعا جس درجے کے مذہبی عقیدہ کی طرف اشارہ کرتی ہے وہ ظاہر ہے خصوصیت کے  
ساتھ صندل سے مانگ کا بھرا ہونا خاص ہندوؤں کی رسم ہے۔ جواب وہی ہے جو اس نوعیت کے دوسرے اعتراضوں کا  
دیا جا چکا۔ میرانیس واقعات نہیں بیان کر رہے ہیں بلکہ حضرت زینب کے جذبات کی ترجمانی ہندوستانی نسوانی زبان میں  
کر رہے ہیں جس مصرع پر وہ مانگ بھوں چڑھاتے ہیں اس قدر مقبول ہوا ہے کہ زباں زد ہو گیا ہے۔ یہ فاروقی صاحب کی  
سمجھ کا پھر ہے کہ ایک شے کو جو بطریق محاورہ یا مجاز مرسل استعمال ہوئی ہے اصل مفہوم میں لیتے ہیں۔ کسی عورت کا عورت  
کو دعا دینا کہ مانگ صندل سے بھری رہے اس کا یہ مدعا ہر گز نہیں کہ فی الواقع مانگ میں صندل بھرا ہو بلکہ یہ کہنا ہے کہ شہاگ  
قائم رہے، شوہر زندہ رہے۔ علاوہ بریں جہاں تک مجھے علم ہے ہندو عورتیں مانگ میں صندل نہیں بلکہ سیندر بھرتی ہیں  
صندل بطور قشقہ استعمال ہوتا ہے۔ یہ امر قطعاً غیر متعلق ہے کہ عرب عورت اس حالت میں کیا دعا مانگتی۔ جہاں تک  
ہندوستانیوں کے جذبات کا تعلق ہے یہ دعا بالکل فحیرل ہے اور انیس کے مخاطب ہندوستانی ہیں نہ کہ عربین و عرب  
کے مسلمان۔

فاروقی صاحب نے اسی قبیل کے دوسرے بے سرو پا اعتراض کئے ہیں۔ مثلاً جس وقت امام حسینؑ حضرت رسولؐ کا

لباس زیب تن کرتے ہیں اُس وقت بھی انیس نے ظاہری چیزوں پر زور دیا ہے، حضرت رسول کے اعلیٰ خیالات و عقاید کا کوئی اثر نہیں دکھایا بلکہ صرف اتنا کہا کہ:- ”کپڑوں سے آرہی تھی رسولِ زمین کی بو“۔ حالانکہ انیس نے ایک مصرع میں وہ کچھ کہہ دیا ہے جو ورق کے ورق سیاہ کرنے سے بھی اس بلاغت اور اس شان کے ساتھ ادا نہ ہوتا۔ وہ مصرع یہ ہے:-  
 ”معراج میں رسول نے پہنا تھا جو لباس“ یعنی جو لباس ہنگام معراج حضرت رسول کے جسمِ مطہر پہ تھا وہی حسین زیب تن کر کے اور راہِ خدا میں سر دے کر معراج رسول کی شان دو بالا کر دیں گے، وہ معراج جو عرش پر ہوئی تھی اب وہی نوکیل نیر پر ہو گی لیکن رتبہ میں اُسی معراج کی ہمسر۔ مگر جو لوگ یورپ کا پیالہ چڑھائے ہوئے ہیں اور یورپ کا کلمہ پڑھتے ہیں اُن کی مادہ پرست ذہنیت ان لطافتوں کا اندازہ کرنے سے بجا طور پر معذور ہے۔  
 پھر فاروقی صاحب فرماتے ہیں کہ اس مرثیہ میں ایک عجیب عقیدہ کا بیان ہے اور وہ یہ کہ تمام فوجِ شام دہائی بول گئی:-

پھر تو یہ غل ہوا کہ دہائی حسین کی      اللہ کا غضب ہے لڑائی حسین کی  
 دریا حسین کا ہے ترائی حسین کی      دنیا حسین کی ہے خدائی حسین کی  
 بیڑا بچایا آپ نے طوفاں میں فوج کا  
 اب رحم واسطہ علی اکبر کی روح کا  
 اکبر کا نام سن کے جگر پر لگی سناں      آنسو بھر آئے روک لی رہوار کی عناں  
 مرگ کر پکارے لاش پسر کو شہ زماں      تم نے نہ دیکھی جنگ پیرا سے پدر کی جاں  
 قسمیں تمہاری روح کی یہ لوگ دیتے ہیں  
 لو اب تو ذوالفقار کو ہم روک لیتے ہیں

فاروقی صاحب کا خیال ہے کہ یہ محض عقیدہ ہے اور اس قدر جاہلانہ عقیدہ کہ اگر ذرا منطق سے کام لیا جائے تو یہ بیکار ہو جاتا ہے۔ امام کا پوری قوت سے لڑتے رہنا اور پھر اک دم یوں رک جانا جیسے معاذ اللہ ان میں کو دم نہیں ہے سوال یہ ہے کہ ایپک شاعری کی شان قائم رکھنے کو اس قدر قدرت پر استا جبر مناسب حال ہے یا لڑتے لڑتے شہید ہو جانا۔ جہاں میں نے ایپک شاعری کے خصوصیات بیان کئے ہیں وہ مقام دوبارہ پڑھئے اور انیس کے کمال فن کی داد دیجئے۔ اس طرز نے ایپک میں ڈرامائی شان پیدا کر دی۔ ٹریجڈی میں حیرت کا عنصر ضروری ہے لیکن ایپک اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھتی ہے اور اپنے میں بظاہر تعجید از قیاس اور ناقابل یقین باتوں کو بھی شامل کر لیتی ہے کیونکہ اس طرح انتہائی حیرت رونما ہوتی ہے۔ انیس نے ایک معمولی شخص کا کیریکٹر نہیں دکھایا ہے، بلکہ ایسے شخص کا جو امام ابن امام ہے جو پروردہ آغوش رسول ہے اور راکب دوش رسول رہ چکا ہے، وہ فوجِ شام کو اپنی تیغ زنی سے مغلوب

کرتا ہے اور جب وہ اتنے مجبور و حواس باختہ ہو جاتے ہیں کہ ملی اکبر کی روح کا واسطہ دیتے اور رحم کے خواستگار بنتے ہیں تو یہ کریم ابن کریم ہاتھ روک لیتا اور جام شہادت نوش کرتا ہے۔ ایسے ہیرو کو ایسا کیریکٹر زیب دے گا یا منطق زدہ ذہنیت رکھنے والوں کا مفروضہ کیریکٹر کہ بھائیو مارو اور مر جاؤ۔ کردار کی ان بلندیوں تک جو ایک ہیرو ایک روحانیت سے لبریز ہستی کی فرش پا انداز میں عوام کی رسائی کہاں جب خود فاروقی صاحب کا طائر فکر کا شہپر ایک ہی جنبش پرواز میں جھول گیا۔ فاضل ادب مغربیہ حضرت فاروقی اگر اس موقع پر جوٹلس سیزر کا (Cicero) سنا (C) کہہ کر حملہ آور قاتلوں کی ممانعت سے باز رہنا یاد کر لیتے تو بھی ممکن تھا کہ انیس کی مایہ ناز کردار نگاری کی ٹوٹی پھوٹی داد دے سکتے۔ اور میرا دل چاہتا ہے کہ اپنا یہ شعر پڑھ کر لکھنے سے ہاتھ کھینچ لوں :-

بعد اس کے دشمنوں کی دشمنی کا کیا لگد

جو تھے اپنے جب وہی مل کر دغا دینے لگے

یہاں سے فاروقی صاحب نے پھر وہی رونے کا دکھڑا رونا شروع کر دیا ہے۔ مجھے جو کچھ اس باب میں کہنا تھا کہ چکا مزید فائدہ فرسائی فضول ہے۔

ضمیمہ بابت مئی ۱۹۷۷ء کے اختتام کے قریب فاروقی صاحب کا فیصلہ یہ ہے کہ انیس میں ڈرامائی صلاحیت بالکل نہ تھی اور اسی طرح نہ تو ایک کی عظمت اور فلسفہ اور اعلیٰ خیالات پیش کرنے کی قابلیت تھی اور نہ ان کے فن کو اس عظمت کی طرف لیجا یا جاسکتا ہے جو ایک کی جان ہے۔ میں کہیں دکھا چکا ہوں کہ میرا انیس کے مراثنیٰ میں ایک شاعری کے تمام لوازم با حسن وجہ موجود ہیں، اعادہ کی ضرورت نہیں۔ فی الحال ان کے اس مختص اعتراض کا جائزہ لیا جائے گا جو انھوں نے ایک خاص مرثیہ (جب کربلا میں داخلہ شاہ دیں ہوا) پر اس امر کے ثبوت میں وارد کیا ہے کہ انیس کے مراثنیٰ میں ڈرامائی عناصر معدوم ہیں۔

پہلا اعتراض یہ ہے کہ:-

”دریا کے کنارے حضرت عباس نے خیمے نصب کر لیے ہیں یا کرنے والے ہیں یہ بات مرثیے سے صاف نہیں

ہوتی اور یہی اس واقعہ کے سلسلہ میں سب سے بڑی ڈرامائی خامی ہے“

اگر مرثیہ ہی سے ثابت کر دیا جائے کہ یہ خام خیالی ہے تو فاروقی صاحب کا یہ قول غلط ہو جاتا ہے کہ مراثنیٰ میں ڈرامائی عناصر کا عدم وجود برابر ہے۔

یہ بات مرثیے سے آئینے کی طرح روشن ہے کہ خیمے نہر کے کنارے اُتارے گئے تھے لیکن ابھی نصب نہ ہوئے تھے

کہ فوج شام آپہنچی۔ حضرت امام حسین نہر کے قریب گھوڑا روک کر فرماتے ہیں:-

”اُترو مسافر و کہ سفر ہو چکا تمام“ - - - - - ”اُٹھو سے بار اُتار کے برپا کرو خیام“

”اُترایہ پہلے کشتی امت کا ناخدا۔۔۔“ دیکھو تو کیا ترائی ہے کیا نہر کیا فضا۔۔۔“

”ٹھہرے کنار نہر جواتان ماہر و دھویا کسی نے رخت کسی نے کیا وضو“

جس چیز نے فاروقی صاحب کو دھوکا دیا وہ اُس ادب و آداب سے نا محرومی ہے جس کی نگہداشت کلام انیس کا طرہ امتیاز ہے۔ حضرت عباس، حضرت امام حسین سے دست بستہ استفسار کرتے ہیں کہ خیمے کہاں نصب ہوں۔ حضرت زینب، حضرت امام حسین کی بڑی بہن ہیں لہذا وہ فرماتے ہیں کہ اُن سے دریافت کرو، وہ جہاں حکم دیں وہیں خیمے نصب ہوں۔ حضرت عباس اُن کی خدمت میں جاتے ہیں وہ فرماتی ہیں کہ بھیا مجھے اس امر میں کیا دخل، جہاں میرے بھائی کو چین ملے وہیں نصب کراؤ، حضرت عباس اُن کو فقط اطمینان ہی نہیں دلاتے بلکہ اپنی رائے کا بھی اظہار کر دیتے ہیں۔

”لیکن کوئی ترائی سے بہتر نہیں ہے جائے حضرت زینب فرماتی ہیں کہ میں نے تمہیں کو اختیار دیا۔ بعد ازاں

سے آیا حضور سبط پیمبر وہ جاں نثار کی عرض خیمہ نہر پر کرتا ہے خاکسار

اور حضرت امام کی رضا مندی اس مصرع میں ہے:- ”بولادہ بحر فیض کہ اچھا قبول ہے“

پھر کیا ہوا؟ ”کھلوار ہے تھے خیموں کو عباس ذی وقار“

”ناگہ اٹھا شمال کی جانب سے اک غبار رایت سیاہ و سرخ نظر آئے تین چار

مڑ کر کہا حبیب نے کچھ رنگ اور ہے بولا کوئی یہ شام کے لشکر کا طور ہے“

یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ:- ”جنگی سپاہ گھاٹ کے نزدیک آگئی“

ایک تجویز بھی سمجھ سکتا ہے کہ خیمے اونٹوں سے اُتار کر کھولے جا رہے تھے تاکہ نصب کئے جائیں اتنے میں فوج شام آگئی اور خیموں کا برپا ہونا تعویذ میں پڑ گیا۔

جہاں باتیں ہو رہی ہیں وہیں حضرت عباس موجود ہیں اور خادموں سے کہتے ہیں کہ:-

”دریافت تو کر کہ ارادہ ہے ان کا کیا؟ لیکن فاروقی صاحب کو پتہ نہیں چلتا کہ حضرت عباس کہاں ہیں!

اس کا کیا علاج؟

یہاں تک پہنچتے پہنچتے فاروقی صاحب اپنا قول بھول جاتے ہیں کہ ایک پکڑا منہ نہیں البتہ اس میں ڈرامائی شان ہونا

چاہئے، واقعات مصور ہو کر متحرک ہو جائیں اور ایجاز و اطناب کی غیر متعلق بحث میں الجھ جاتے ہیں۔ اس بارے میں ارشاد ہوتا ہے کہ حضرت عباس کو بڑا جلال آتا ہے اور وہ کم از کم میں بندوں میں تقریر کرتے ہیں، جس میں جلال کا اثر دیکھا ہوتے ہوئے آخر تک بالکل مفقود ہو جاتا ہے۔

غریب انیس کو کیا خبر تھی کہ اُسے ایسے نقادوں سے پالا پڑے گا جو اس بند کو پڑھنے کے بعد جس میں ایک غیور

شجاع کی جو پاس ادب سے مجبور ہو جائے لا جواب تصویر ہے سرد دھننے اور دجہ کرنے کے بجائے ایسی ناقدی کر نیگے

اور کہیں گے کہ حضرت عباس کے جلال کا اثر دھیسما ہوتے ہوئے آخر تک بالکل مفقود ہو جاتا ہے! سنئے:-  
 آقا نے دی جو اپنے سر پاک کی قسم، بس تھر تھرا کے رہ گیا وہ صاحب کرم  
 پر تھی شکن جبین پہ نہ ہوتا تھا غیظ کم چپ ہو گئے قریب جو آئے سہ ام

گردن جھکا دی تاناہ ادب میں خلل پڑے

قطرے ہو کے آنکھوں سے لیکن نکل پڑے

ایسی ہی لاطائل باتیں اور ہیں جن کی تفصیل میں جانا تفصیع اوقات ہے۔ البتہ ایک بوکھلا سٹ کا ذکر بے جا نہ ہوگا  
 صفحہ ۴۶ پر وہ عبارت ہے جو پہلے نقل ہو چکی یعنی:-

”دریا کے کنارے حضرت عباس نے خیمے نصب کئے ہیں یا کرنے والے ہیں یہ بات مرثیہ سے صاف نہیں

ہوتی اور یہی اس واقعہ کے سلسلہ میں سب سے بڑی ڈرامائی خامی ہے۔“

اور صفحہ ۴۷ پر یہ عبارت ہے:-

”فضہ کی بابت یہ اشارہ ملتا ہے کہ اُس نے محل سے منہ نکال کر کہا جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ابھی خیمے نصب

نہیں ہوئے حالانکہ شروع میں ہمیں بتایا گیا تھا کہ خیمے لگ چکے ہیں۔“

جو شخص اس دیدہ دلیری سے متضاد اقوال پیش کرتے ذرا نہ جھپکے اُس کے متعلق کیا کہا جائے؟

مرزا جعفر علی خاں اثر

(باقی)

## ”تنقیدی اشائے“ کا تازہ ادیشن

پروفیسر آل احمد سرور۔ ریڈر شعبہ اُردو لکھنؤ یونیورسٹی کے انیس تنقیدی مقالات کا مجموعہ جو ہندوستان کی  
 مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے۔ پروفیسر سرور اس عہد کے صفحہ اول کے نقادوں میں سے ہیں اور  
 ان کے تنقیدی مقالات سندی حیثیت رکھتے ہیں۔ مقالات کی فہرست یہ ہے:-

اُردو ناول کا ارتقا اُردو میں فسانہ نگاری اُردو میں خمرات خطوط میں شخصیت انگریزی شاعری۔  
 ہندوستانی ادب میں حالی کا درجہ اکبر شخصیت اور آرٹ چکبست لکھنوی اقبال اور ان کا فلسفہ  
 فانی بدایونی رتن ناتھ سرشار ہندوستانی ادب میں آغا حشر کا درجہ سرسید کے خطوط مکاتیب مہدی  
 خنداں جدید اُردو تنقید حیات شبلی مجھے کون کون سی کہانیاں پسند ہیں اس ادیشن میں پچھلے ادیشنوں  
 سے کافی اضافہ کیا گیا ہے۔ ۲۳۲ صفحات کاغذ ۲۸ پونڈ۔ مجلد مع رنگین گروپوش۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول۔ منیجر نگار۔ لکھنؤ

## باب امر اسلہ والمنظرہ

### سائنس اور اسلام۔ خوارق عادات اور قانون قدرت

یہ ہے عنوان مولانا بشیر احمد عثمانی مرحوم کے ایک مقالہ کا جو کراچی کی مجلس علمستان کے علمی مہنامہ مستقبل میں شائع ہوا ہے۔ اس مقالہ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ”معجزات و خوارق“ اپنی جگہ ناقابل انکار حقایق ہیں اور وہ لوگ جو ان کو تسلیم نہیں کرتے وہ سخت تنگ نظر ہیں۔

اگر فاضل مقالہ نگار اس موضوع پر خالص مذہبی نقطہ نظر سے گفتگو کرتے اور وہ صرف اس بات پر زور دیتے کہ چونکہ مذہب معجزات کا قائل ہے اس لئے بغیر کسی حجت و برہان کے اسے تسلیم کر لینا چاہئے تو اس پر گفتگو کی گنجائش نہ تھی، کیونکہ بغیر حجت و برہان کے تعلیمات مذہب کو مان لینا بھی اپنی جگہ ایک اصولی بات ہے اور اس پر تنقید کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن چونکہ انھوں نے مذہب کے دائرہ سے ہٹ کر اس مسئلہ کو سائنس کی روشنی میں دیکھا ہے اس لئے ہر شخص کو حق پہنچتا ہے کہ وہ سائنس ہی کو سامنے رکھ کر اس مقالہ کے متعلق رائے قائم کرے۔

اس میں شک نہیں مولانا نے اس بحث کو بڑے دلچسپ رنگ میں پیش کیا ہے، لیکن ہمیں افسوس ہے کہ جو عقلی دلائل انھوں نے معجزہ و خوارق عادات کے ثبوت میں تحریر فرمائے ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی مفید یقین نہیں۔ مولانا نے جو کچھ فرمایا ہے اس کا خلاصہ انھیں کے الفاظ میں یہ ہے:-

اگر سچ پوچھو تو جن چیزوں کو خوارق عادات کہتے ہیں۔ ان کا قانون خود ”خوارق“ کے منکرول نے بنوایا ہے جب یہ لوگ عام قوانین فطرت کی عجوبہ کاری کو خود مقنن کی حکمت بالغہ، اختیار کامل اور شان ”خلاق الما ایشاء وفعال الما یرید“ کی طرف منسوب کرنے میں بھی تردد کرنے لگے تو ضروری ہوا کہ ان قوانین کو قوانین قدرت ثابت کرنے کے لئے قدرت بڑی کوئی سامان کرتی۔

چنانچہ ابتداءً آفرینش سے آج تک قدرۃ بے شمار خوارق ظاہر کرتی رہی جنہیں دیکھ کر خواہی خواہی اعتراض کرتا پڑتا ہے کہ جو فعل جن وسائل کے ذریعہ سے عموماً ہوتا رہتا ہے اُسے بلا واسطہ کرنے میں بھی قدرت کو کچھ تعجب نہیں ہوتا۔ تماشہ یہ ہے کہ عام قوانین فطرت کی فضا میں جب بعض غیر معمولی واقعات حسب اتفاق پیش آجاتے ہیں تو ہم ان کے

ماننے والوں سے جنگ نہیں کرتے۔ لیکن اسی کے مشابہ کوئی چیز جو روزمرہ کے عام معمول سے ذرا مستبعد ہو اگر کسی بڑے بڑے جلیل القدر پیغمبر کی طرف منسوب ہو جائے تو فوراً شکوک و شبہات کی لہر ہمارے دلوں میں دوڑنے لگتی ہے اور اس کی نفی کرنے کی ہر ممکن صورت پر ہم غور کرنے لگتے ہیں۔

فرانس کے مشہور و معروف فیلسوف کائل فلامریون نے اپنی کتاب "المجہول والمسائل الروحانیہ" میں ایسی عورت کا ذکر کیا ہے جس کا پستان بائیں ران میں تھا اور وہ بچہ کو اسی سے دودھ پلاتی تھی یہ عورت ۱۸۲۷ء میں "پیرس" کی جمعیت فضلاء کے روبرو پیش ہوئی۔

پھر ایسے مشاہدات بیاں کئے ہیں کہ ایک مرد کے پیٹ سے تشریح کے بعد لڑکا نکلا جو اس مرد کا توام تھا۔ اس کے جسم میں مدۃ العمر مجبوس رہا۔ ڈاڑھی نکلی اور بوڑھا ہوا۔

اب فرض کیجئے کہ اسی طرح کے فلتات طبعیہ کو اگر کوئی شخص یہ کہدے کہ فلاں پیغمبر کے اعجاز یا فلاں ولی کی کرامت سے فلاں زمانہ میں ایسا ہوا تھا۔ تو منکرین اعجاز کسی نہ کسی عنوان سے اس کی تردید پر فوراً کمر بستہ ہو جائیں گے۔

جاپان میں قیامت خیز زلزلہ آیا۔ کتنی ہی بستیاں تباہ ہوئیں اور کتنی ہی مستحکم عمارتیں منہدم ہو گئیں۔

چند سال ہوئے ضلع ہردوئی میں بگولہ اٹھا جس سے ایک جھیل کا پانی بالکل اڑ گیا اور دوسری جگہ جھیل بن گئی اس طرح کے واقعات جو غوارق میں سے نہیں صرت قلیل الوقوع ہیں۔ ہم سنتے ہیں اور ایک منٹ کے لئے بھی ان کو غلط نہیں سمجھتے۔

لیکن کیا قیامت ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کے وقت اگر معتبر سے معتبر راوی بھی یہ خبر دے کہ ایوان کسریٰ میں زلزلہ آیا۔ اس کے چودہ لکڑے گر پڑے یا دریائے سادہ خشک ہو گیا یا فارس کی ہزار سالہ آگ بجھ گئی تو متشککین کو اس کے ماننے ماننے میں پس و پیش ہونے لگتا ہے۔

خیال کیجئے زلزلہ کا آنا۔ کسی بڑی سے بڑی عمارت کا شکستہ ہونا۔ دریا کا خشک ہو جانا اور آگ کا بجھنا ان میں کوئی سی چیز محال ہے۔ چیزیں تو فی حد ذاتہ غوارق میں سے بھی نہیں۔ پھر اگر یہی چیزیں سب سے جلیل القدر اولوالعزم پیغمبر کے قرب و وجاہت ظاہر کرنے یا اس کے عظمت آباستقبال کی طرف اشارہ کرنے کے لئے حق تعالیٰ ظاہر فرماتا ہے۔ تو تم کو کیوں تردد ہونے لگتا ہے۔

روح کے متعلق یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس کی تاثیر و تاثر میں بعد مکانی یا زمانی خلل انداز نہیں ہوتا اور اس جو ہر لطیف و نورانی کو اپنے عمل میں مسافت جسمانی کی کچھ پرواہ نہیں۔

پس اگر روح محمدی صلعم کو نورانیت عظیم نے حضرت آمنہ کے لئے مکہ سے بھری تک روشنی کر دیا تو اس میں کیا اشکال ہے۔

کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ خداوند قادر و توانا، نظام تکوین اور قوانین طبیعیہ کے استعمال میں کوئی تصرف آپ کی اطلاع اور مشورہ کے بدون نہ کیا کرے (مغوذ باللہ)

اس کی امید آپ خدا سے تو کیا، اس مسکین ایتھر سے بھی نہ رکھیں جو ہر قسم کے علم و شعور، قدرت اور ارادہ سے محروم ہے آج ہم دیکھتے ہیں کہ ایک انگریز ماہر علم بصارت نے انسان کی جلد میں قوت باصرہ کے راز پر روشنی ڈالی ہے وہ لکھتے ہیں کہ انسان کے بدن کی جلد کے نیچے چھوٹے چھوٹے ذرات پائے جاتے ہیں جو سارے جسم میں پھیلے ہوئے ہیں یہ ذرے ننھی ننھی آنکھیں ہیں ان میں اسی طرح تصویر اتر آتی ہے جس طرح آنکھ کی پتلی میں اتر آتی ہے۔ یہ خیال کہ انسان کی کھال بھی اسی طرح دیکھتی ہے جس طرح آنکھیں، کوئی نیا نہیں ہے، آپ جب کسی ماینا شخص کو بازار میں بھڑ سے بچ کر گزرتے دیکھتے ہیں تو تعجب کر گزرتے دیکھتے ہیں تو تعجب کرتے ہیں کہ یہ اندھا ہے اسے راستہ کس طرح سوچتا ہے انسان کی پیشانی کی جلد کے متعلق یہ خیال ہے کہ اس میں قوت باصرہ موجود ہے۔ دماغ کو اسی طرح پیغام پہنچاتی ہے۔

ڈاکٹر فرگول کا بیان ہے کہ آج سے ہزاروں سال پیشتر آنکھوں کے بغیر پڑھنے کا ہنر اپنے کمال کو پہنچا ہوا تھا اور عام طور پر رائج تھا۔ لیکن جب انسان کو یہ معلوم ہوا کہ وہ آنکھوں سے بھی وہی کام لے سکتا ہے جو بدن کی جلد سے لیتا ہے تو اس نے جلد سے دیکھنے کا طریقہ ترک کر دیا اور بالآخر جلد سے دیکھنے کی قابلیت اس میں سے مفقود ہو گئی۔ اگر اس عمل کو دوبارہ ترقی دیکھائے تو تعجب نہیں ہے کہ اس کے ذریعہ سے اندھے بھی دیکھنے لگیں۔

بہر حال سائنس کی ترقی خوارق کی تفہیم میں بہت کچھ مدد دے رہی ہے اور اسی نے ہم امید رکھنے میں حق بجانب ہیں کہ کچھ عرصہ کے بعد انشا اللہ تعالیٰ سائنس کے پجاری خوارق کی تسلیم کے لئے گردن جھکا دیں گے۔

ابھی چند روز پہلے جب یہ سنتے تھے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے درخت جھک گئے یا انھوں نے حضور کو سلام کیا یا حضور کے ایما سے وہ اپنی جگہ سے سرک گئے تو محدثین ان قصوں کی "اساطیر الاولین" کہ کہنسی اڑاتے تھے۔ اور ان بیانات کو پیرانے مسلمانوں کی خوش اعتقادی یا دہم پرستی پر حمل کرتے تھے لیکن آج ماہرین علم نباتات نے نباتاتی زندگی کے جو حیرت انگیز حالات ظاہر کئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ درخت اور پودے فی الواقع زندگی کے وہ تمام حیات و تاثرات اپنے اندر رکھتے ہیں جو ابھی تک ذی روح مخلوق کی خصوصیت سمجھے جاتے تھے ہر شخص جو نباتاتی زندگی سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے، جانتا ہے کہ پودے اور پھول بھی اپنی غذا کھاتے اپنا پانی پیتے اور اپنی نیند سوتے ہیں۔ ان میں بھی جنسوں کا وصل و جفت ہوتا ہے ان کی بھی نسل چلتی ہے اور ان پر بھی بڑھا پاتا ہے اور وہ بھی بالآخر موت کے چنگل میں پھنستے ہیں۔

لیکن بہت کم لوگ یہ یقین کرنے کے لئے طیار ہوں گے کہ پودے دیکھنے اور سننے کی بھی قدرت رکھتے ہیں آپس میں بات چیت بھی کرتے ہیں ان پر عشق و محبت کا دار چلتا ہے رنج و غم ان کو بھی ستاتا ہے اور وہ بھی ہماری طرح جذبات

حیات سے تاثر پذیر ہوتے ہیں۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض پودے اور پھول محض ہاتھ لگا دینے سے سکڑ جاتے ہیں اور ذرا سے اشارے سے بند ہو جاتے ہیں، اس ذکی الحسی کی وجہ سے ایک پودے کا نام ہی ”چھوٹی موٹی“ پڑ گیا ہے۔

یہ تو حالات ہیں کہ ہر انسان اپنی چشم عریاں سے دیکھ سکتا ہے لیکن ہندوستان کے ایک ہم۔۔۔۔۔ ماہر سائنس یعنی ”سر جگدیش چندر بوس“ نے اپنی مدۃ العمر کے تجربات سے پودوں اور درختوں کے جو حالات اپنے ایجا کردہ عجیب و غریب آلات کے ذریعہ معلوم کئے ہیں ان سے علم نباتات میں حیرت انگیز انقلاب پیدا ہو گیا ہے۔

ہم اسلامی تاریخوں میں ”یا ساریۃ الجبل“ کا مشہور واقعہ پڑھتے تھے لیکن ”وائرلیس“ کی ایجاد سے پہلے ہمارے لئے یہ سمجھا تا کس قدر مشکل تھا کہ شاید ایک روحانی ”وائرلیس ٹیلیفون“ کے ذریعہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آواز ساریہ رضی اللہ عنہ تک پہنچ گئی ہو۔

عالمگیر جنگ کے زمانہ میں ایک لاسلکی پیام پٹر و گریڈ سے لندن کو چلا راستہ میں بعض جرمن اُسے جذب کرنے لگے اور پر سے ایک فرانسیسی طیارہ نے ان جذب کرنے والوں پر بم پھینکا اور جرمن اپنی سعی میں ناکام رہے۔ دیکھئے یہ مادی واقعہ اس روحانی واقعہ سے کس قدر مشابہت رکھتا ہے عرش سے جو لاسلکی پیام سرزمین حجاز کو جا رہا ہے شیاطین اس کو اچکنا چاہتے ہیں لیکن اوپر سے شہاب ثاقب کا گولہ ان کا کام تمام کر دیتا ہے اور وہ ناکام میاں نامراد دھکیل دئے جاتے ہیں۔

اس قسم کے ہزاروں سائنٹفک شواہد و نظائر نے غوارق اور دیگر مشکل اور غامض مسائل کی تفہیم کے متعلق ہماری کام کو بہت آسان کر دیا اور قوانین قدرت کی نسبت اپنی تنگ نظری اور کم مائیگی کی بنا پر جو غلطیاں ہم کر رہے تھے ان میں سے بہت سی اغلاط کی اصلاح کر دی ہے۔

اب قانون قدرت کا لفظ استعمال کرتے وقت ہم کو بڑی احتیاط کرنی پڑتی ہے اور کسی چیز کو رزمۃ کے معمول کے ذرا اختلاط دیکھ کر جھٹ پٹ یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ وہ قانون قدرت کے خلاف ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ ”قانون قدرت“ کے اس لفظ سے کبھی ہم کو بہت کچھ دھوکا دیا گیا ہے یہ لفظ مرعوب کرنے والا تو بہت ہے مگر ہم جس مضمون کو اس لفظ سے ادا کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی یہ صحیح تعبیر نہیں فی الحقیقت جس چیز کا نام ہے ”قانون قدرت“ رکھا ہے وہ قانون عادت ہے۔

اس مقالہ میں جن دلائل سے کام لیا گیا ہے، وہ بظاہر مضبوط نظر آتے ہیں، لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ بہت کمزور ہیں اور ان کی حیثیت منطقی مغالطوں سے زیادہ نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک عامی مولانا کے ان دلائل کو دیکھ کر عجرات کا قایل ہو جائے، لیکن ایک پڑھا لکھا انسان کبھی ان پر مطمئن نہیں ہو سکتا۔

مولانا کے دلائل کی روح صرف اس دعویٰ میں پنہاں ہے کہ ”جو فعل جن وسائل کے ذریعہ سے عموماً ہوتا رہتا ہے اسے بلا واسطہ کرنے میں بھی قدرت کو کچھ تعب نہیں ہوتا“ اس دعویٰ کے ثبوت میں آگے چل کر انھوں نے بہت سی مثالیں پیش کی ہیں، لیکن ان میں سے کوئی مثال ایسی نہیں ہے جو ان کے اصلی دعویٰ کے ثبوت میں پیش کی جاسکے۔ ان کا اولین اساسی دعویٰ یہ ہے کہ ”خدا بغیر ذریعہ و واسطہ کے بھی سب کچھ کر سکتا ہے“ اور اس کے ثبوت میں انھوں نے صرف دو مثالیں پیش کی ہیں ایک کسی عورت کے پستان کا ران میں پایا جاتا دوسرے مرد کے پیٹ سے لڑکے کا نکلنا۔ اگر ہم ان لیں کہ فلا مریون کوئی مجھول راوی نہیں ہے تو اس سے یہ بات کیونکر ثابت ہوتی ہے کہ ان واقعات کا ظہور بغیر کسی سبب یا واسطہ کے ہوا تھا، عورت اور مرد دونوں کھلے ہوئے واسطے موجود ہیں اور ان کی علمی توجیہ بھی مشکل نہیں۔ وہ غدود جو سینہ میں پیدا ہو کر دودھ پیدا کرنے کا باعث ہو سکتے ہیں عورت کے ران میں پیدا ہو گئے ہوں گے اور اسپر مٹو ذرا جس سے تخلیق انسانی سے ہوتی ہے، مرد کے پیٹ میں نشوونما پاتا رہا ہوگا۔ ان واقعات کے پیش نظر زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ دونوں باتیں قدرت کے عام دستور سے ہٹ کر ظاہر ہوئیں، لیکن یہ کہنا کہ ان کا کوئی سبب واسطہ نہیں تھا، نادرست ہے۔ کسی بات کا سبب نہ معلوم ہوتا دوسری چیز ہے اور سبب نہ پایا جانا دوسری چیز اگر فلاسفی کو کوئی سبب معلوم نہیں ہوا تو یہ اس کا جہل تھا اور اس پر اعتماد کر کے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کا کوئی سبب موجود تھا۔ بغیر کسی سبب واسطہ کے ایک چیز کے وجود میں آجانے کے متعلق مولانا نے ایک بات بہت دلچسپ لکھی ہے۔ فرماتے ہیں:-

”دیکھو ہم اس قادر مطلق کی یہ عادت برابر دیکھتے چلے آتے ہیں کہ وہ بچہ کو رحم مادر سے نکالتا ہے اور پھر بتدریج پرورش کرتا ہے، چنانچہ ہم میں سے کسی نے نہیں دیکھا کہ کوئی جوان انسان یونہی آسمان سے گرا دیا گیا ہو، یا زمین سے اُگ آیا ہو، مگر اس کے باوجود ہم یقین رکھتے ہیں کہ اس کی عادت مستمرہ کے خلاف رحم اور لطفہ کے توسط کے بدن انسان کو پیدا کرنا بھی خدا کی قدرت میں داخل ہے۔ آخر ابتداءے آفرینش میں جب انسان پیدا کیا گیا تو یقیناً اس کی کیفیت اس متعارف طریقہ پیدائش سے بالکل علیحدہ تھی اور تمام اقوام و ملل کو تسلیم کرنا پڑا ہے۔ کہ اس وقت ایک یا متعدد انسان بغیر از دواجی وسائل اور موجودہ قانون تناسل کے جوان جوان محض خدا کی قدرت اور اس کے ارادہ سے پیدا ہو گئے۔“

پہلے خود ہی فرماتے ہیں کہ ”ہم میں سے کسی نے نہیں دیکھا کہ کوئی جوان انسان یونہی آسمان سے گرا دیا گیا ہو یا زمین سے اُگ آیا ہو“ اور پھر ارشاد ہوتا ہے کہ ”ابتداءے آفرینش میں جب انسان پیدا کیا گیا تو یقیناً اس کی کیفیت اس متعارف طریقہ پیدائش سے بالکل علیحدہ تھی اور تمام اقوام و ملل کو تسلیم کرنا پڑا ہے کہ اُس وقت انسان بغیر از دواجی وسائل اور موجودہ قانون تناسل کے جوان جوان محض خدا کی قدرت اور اس کے ارادہ سے پیدا ہو گئے۔“

گویا اب تو نہیں لیکن اول اول انسان آسمان سے گرایا گیا تھا یا زمین نے اُسے اُگایا تھا، اور لطف یہ ہے کہ وہ اسے صرف اپنا نہیں بلکہ تمام اقوال و افعال کا تسلیم کیا ہوا نظریہ ظاہر کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت دنیا کی قوموں نے تخلیق انسانی کے متعلق یہی نظریہ قائم کیا ہو، لیکن اگر آج کسی کے سامنے یہ بات کہی جائے کہ اول اول خدا نے ڈنڈ پیلے ہوئے جو ان جوان انسان آسمان سے بنا بنا کر زمین پر برسائے تھے تو وہ اس کے سوا کہ ہمیں دیوانہ سمجھ کر نہیں پڑے اور کیا کہہ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ مولانا نے اپنے دلائل کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے اس کا تعلق حوادث طبیعی یا علمی اکتشافات سے ہے اور وہ خود بھی ان کے وجود یا ظہور کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتے وہ سبب و واسطہ سے بے نیاز تھا۔

اب آئیے غور کریں کہ مولانا نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا تعلق معجزہ سے کیا ہے، اور وہ کس حد تک اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے ہیں۔

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ معجزہ کا اصطلاحی مفہوم مذہب میں کیا ہے۔ علامہ سید شریف نے شرح مواقف میں لکھا ہے کہ:-

”المعجزة عندنا ما يقصد به تصديق مدعى الرسالة وإن لم يكن خارقاً للعادة“

(معجزہ ہمارے نزدیک وہ ہے جس سے کسی مدعی رسالت کی تصدیق مقصود ہو گو وہ خارق عادت نہ ہو) لیکن اس سے ”خارق عادت“ معجزہ کی نفی نہیں ہوتی۔ اس لئے اب گفتگو کا انحصار اس پر ہو جاتا ہے کہ ”خارق عادت“ کو سمجھ لیا جائے۔ ”خارق عادت“ کی لفظی ترکیب ہی ظاہر کرتی ہے کہ اس سے مراد وہ واقعہ یا حادثہ ہے جو عادتاً عام اصول فطرت کے خلاف ظاہر ہو یعنی کسی ایسی بات کا ظہور جو عادتاً محال ہو، مثلاً کسی عورت کا سانپ جتنا، دوسرے کھنے والا بچہ پیدا ہونا پانچ کی جگہ کسی کے ہاتھ میں چھ یا اس سے زیادہ انگلیاں پایا جانا وغیرہ وغیرہ۔ اس میں وہ باتیں شامل نہیں ہیں جو عقلاً محال ہیں، مثلاً گیسوں کے درخت سے آم پیدا ہونا، جانور کا انسان کی طرح باتیں کرنے لگنا، یاد و اور دو کے مجموعہ کا چار سے زیادہ ہو جانا۔ پھر غور کیجئے کہ معجزات کا تعلق کس قسم کے خوارق عادت سے ہے۔ ان سے جو عادتاً محال ہیں، یا ان سے جو عقلاً محال ہیں یا دونوں سے؟

مولانا نے اپنے مقالہ میں جو کچھ فرمایا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ معجزہ کو محال عادی اور محال عقلی دونوں سے متعلق کرتے ہیں۔ حالانکہ رسول اللہ سے جو معجزے منسوب کئے جاتے ہیں ان میں کوئی معجزہ ایسا نہیں ہے جس کا تعلق محال عادی سے ہو، سب کے سب محالات عقلیہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کا ذکر ہم آئندہ کریں گے۔ صرف ایک معجزہ ایسا ہے جو حوادث طبیعی سے تعلق رکھتا ہے اور جس کا تعلق نہ محال عقلی سے ہے نہ محال عادی سے اور وہ یہ ہے کہ ولادت نبوی کے وقت ایوان کسریٰ میں زلزلہ آگیا تھا، یہ بالکل حادثہ طبیعی ہے اور اس کا سبب رسول اللہ کی ولادت کو قرار دینا ارادت و عقیدت سے زیادہ نہیں، جس وقت یہ زلزلہ آیا ہے اسی وقت اور بھی بہت سے بچے عجم و عرب میں پیدا ہوئے ہوں گے

اور ان میں سے ہر ایک کی طرف سے اس معجزہ کا دعویٰ کیا جاسکتا ہے۔ اس روایت کا تعلق دراصل حکومت اکاسرہ کے مستقبل سے ہے اور یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ رسول اللہ کی ولادت ایک ایسی ہستی کا وجود میں آیا ہے جو سلطنت کا اثر کی بنیاد کو متزلزل کر دے گا۔ اس روایت کو مادی حیثیت سے دیکھنا درست نہیں، کیونکہ زلزلہ ایک حادثہ طبیعی ہے اور اسے معجزہ کبھی نہیں کہا جاسکتا۔ اگر ایران میں واقعی زلزلہ آیا تھا تو وہ ہر حال آنا خواہ اس وقت رسول اللہ کی ولادت ہوتی یا نہ ہوتی۔ اب ان معجزوں کو لیجئے جن کا تعلق محالات عقلی سے ہے، مثلاً، شق القمر، جسمانی سحراج، آپ کے جسم کا سایہ نہ ہونا، کنکریوں کا انسان کی طرح بول اٹھنا۔ ان کے ثبوت میں جو عقلی دلائل مولانا نے پیش کئے ہیں وہ کسی طرح مفید یقین نہیں۔

ہر چند انھوں نے اس نوع کے عجزات کا ذکر کر کے صراحتاً ان پر کسی جگہ گفتگو نہیں کی ہے، لیکن ضمناً اس قسم کے جن معجزات کا ذکر کیا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ:- ”درخت رسول اللہ کو دیکھ کر جھک گئے اور سلام کیا“ دوسرا وہ ہے جو حضرت عمر سے منسوب کیا جاتا ہے کہ ان کی آواز ”یا ساریۃ الجبل“ بہت دور ساریہ تک پہنچ گئی اور ان معجزات کے ثبوت میں وہ ڈاکٹر بوس ماہر نباتیات کے اکتشافات اور وائٹ لیس کی ایجاد کا ذکر کرتے ہیں، حالانکہ اس سے ان کا مقصود پورا نہیں ہوتا۔

اگر ڈاکٹر بوس نے درختوں میں ایک خاص قسم کا احساس پایا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ کسی شخص کو سلام کرنے کے لئے جھک بھی جائیں کیونکہ اس کا تعلق تعقل سے ہے اور یہ نباتات میں موجود نہیں اسی طرح اگر لاسلکی کے ذریعہ سے کوئی آواز ہزاروں میل تک پہنچ سکتی ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ بغیر ان آلات کی مدد کے بھی جو اس کے لئے وضع ہوئے ہیں آواز کو دور تک پہنچایا جاسکتا ہے۔

علمی شواہد و نظائر اور خوارق عادات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اکتشافات علمی نام ہے ان نوامیس فطرت کے بے نقاب کرنے کا رجن کا علم انسان کو اس وقت تک نہیں ہوا اور خوارق عادات کا تعلق ہے کسی انسان کے مقصد و ارادہ سے، جس میں کوئی مادی لگاؤ نہیں پایا جاتا۔ اگر ڈاکٹر بوس نے نباتات میں ایک خاص قسم کا احساس دریافت کیا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جو بات اس وقت تک معلوم نہ تھی وہ معلوم ہو گئی۔ نہ یہ کہ خود انھوں نے نباتات میں یا احساس پیدا کیا۔ اس لئے اس کو سامنے رکھ کر یقین کر لینا کہ درخت جھک کر کسی کو سلام کر سکتا ہے، حد درجہ طفلانہ استدلال ہے اگر عالم گیر جنگ کے زمانہ میں کسی لاسلکی پیام کو راستہ ہی میں جرمنی نے جذب کر لیا، تو اس سے فرشتوں کا عرش سے پیام لانا اور شیاطین کا اس کو اچک لینے کی کوشش کرنا، کیونکر ثابت ہو سکتا ہے۔ لاسلکی پیام ایک علمی حقیقت ہے، ایک مادی عمل ہے، لیکن عرش فرشتے اور شیاطین جن معنی میں مذہب کی طرف سے پیش کئے جاتے ہیں وہ مادی دنیا سے کوئی تعلق نہیں رکھتے اور صرف ہمارے اعتقاد کی پیدا کی ہوئی چیزیں ہیں۔ اس لئے ایک کا قیاس دوسرے پر

نہیں کیا جاسکتا۔

اس بحث میں زیادہ اُلجھن اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ اہل مذاہب صرف اس عقیدہ کو سامنے رکھتے ہیں کہ خدا سب کچھ کر سکتا ہے خواہ وہ کتنا ہی خلاق عقل و عادت کیوں نہ ہو، حالانکہ سوچنے کی بات صرف یہ ہے کہ خدا اگر ایسا کر بھی سکتا ہے تو کیوں کرے، اس کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ اپنے مقرر کئے ہوئے اصول سے ہٹے اور میں سمجھتا ہوں کہ مذاہب عالم میں مذہب اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے سب سے زیادہ زور اس پر دیا ہے کہ اصول قدرت اٹل ہیں اور ان میں تبدیلی ممکن نہیں۔ ارشاد ہوتا ہے :-

”قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلَىٰ شَاكِلَتِهِ ۖ فَمَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ الْاَلٰ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ الْاَلٰ تَبْدِيْلًا ۚ خَلَقَ كُلُّ شَيْءٍ فَقْدَرَهُ تَقْدِيْرًا ۚ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِمَقْدَارٍ ۚ

موجودہ ذکر آیت کا مفہوم امام رازی نے یہ بتایا ہے کہ ہر چیز ایک مخصوص انداز پر ہے اور اس میں کمی یا زیادتی ممکن نہیں۔ مولانا شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی اس موضوع پر قریب قریب یہی لکھا ہے۔ فرماتے ہیں :- ”جبرت عاودہ اللہ ان لا تنفک الخواص عما جعلت خواص لہا“

یعنی خدا کی عادت ہے کہ وہ اشیاء کے خواص کو نہیں بدلتا، مثلاً آگ کا کام جلانا ہے اور وہ کبھی ٹھنڈک نہیں پہنچائیگی پانی ہمیشہ نشیب کی طرف جائے گا، بلندی کی طرف اس کا بہاؤ کبھی نہیں ہوگا، جو چیز اوپر پھینکی جائے گی وہ ضرور نیچے آئے گی، مادی چیز جب سورج کے سامنے آئے گی تو اس کا سایہ ضرور زمین پر پڑے گا، وغیرہ ہزاروں مثالیں اس طرح کی پیش کی جاسکتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ محالات عقلیہ سے تو معجزات کا تعلق ہو ہی نہیں سکتا۔ رکائیں وہ باتیں جنہیں محال عادی کہتے ہیں یعنی عام طور پر تو وقوع میں نہیں آتیں، لیکن کسی نہ کسی سبب کی بناء پر وہ ظہور میں آسکتی ہیں، سو ان کو معجزہ کہنا کوئی معنی نہیں رکھتا، کیونکہ جب اس کے ظہور کا سبب پیدا ہو جائے گا جو وہیں آجائینگے اور اسی حقیقت کو سامنے رکھ کر مولانا شاہ ولی اللہ صاحب نے ”تفہیمات الہیہ“ میں لکھا ہے کہ :-

”انما المعجزات والکرامات امور اسبابیۃ ولم تترك الا سباب قط ولن تجد لسنة اللہ تبدیلا“

یعنی جن باتوں کو معجزہ و کرامت کہتے ہیں ان سبب کا تعلق اسباب سے ہے اور ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ بغیر سبب کے ان کا ظہور ہو، کیونکہ یہ قانون قدرت کے خلاف ہے۔

اب معجزہ و کرامت کی اس عمومی بحث کو چھوڑ کر، خصوصی حیثیت سے رسول اللہ کے معجزوں پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ان کا تعلق صرف روایات سے ہے، اور قرآن سے اس کی تردید ہوتی ہے۔

سورۃ عنکبوت کی ایک ملاحظہ ہو :-

”قَالُوْا لَوْلَا اَنْزَلَ عَلَیْہِآیَاتٍ مِنْ رَّبِّہٖ قُلْ اِنَّمَا الْاٰیَاتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ“ (یعنی ایک بار کفار

نے اعتراض کیا کہ اگر یہ رسول ہے تو خدا نے اس پر اپنی نشانیاں کیوں نہیں اتاریں۔ اس پر خدا نے فرمایا کہ اب رسول کہہ دو کہ نشانیاں تو خدا ہی کے پاس ہیں تو تم سے صرف یہ کہنے آئی ہوں کہ خدا سے ڈرو اور مجھ سے کام نہ کرو۔ اگر کفار کے اس اعتراض سے قبل رسول اللہ کی طرف سے کوئی معجزہ پیش کیا گیا ہوتا تو اس کا جواب یہ ہوتا کہ یہ تم کیسے کہتے ہو کہ رسول خدا کی نشانی لیکر نہیں آیا، فلاں معجزہ دیکھو، لیکن جواب میں جو کچھ کہا گیا اس کا مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ معجزے دکھانے نہیں آئے بلکہ صرف خدا سے ڈرانے آئے ہیں۔

اب اسی کے ساتھ سورہ بنی اسرائیل کی ۹۲-۹۵ آیات ملاحظہ فرمائیے، جن میں کفار کے اس کہنے پر کہ ہم تیرے اوپر ایمان نہ لائیں گے جب تک زمین سے ہمارے لئے چشمہ نہ جاری یا یہ کہ تیرے پاس کھجور اور انگور کا باغ ہو اور تو اس میں بہتی ہوئی نہریں نہ نکالے، یا یہ کہ آسمان کے ٹکڑے کر ڈالے وغیرہ رسول اللہ نے صرف یہ فرمایا کہ میں تو کچھ بھی نہیں ہوں مگر ایک انسان جس کو خدا نے رسول بنا کر بھیجا ہے۔

اگر نبوت کے ثبوت کے لئے معجزہ پیش کرنا ضروری ہوتا تو اس سے زیادہ مناسب وقت اور کیا ہو سکتا تھا لیکن رسول اللہ نے کوئی معجزہ پیش نہیں کیا بلکہ اصولاً اس سے انکار کر دیا۔

سب سے بڑا معجزہ جو رسول اللہ سے منسوب کیا جاتا ہے اور جس کا ذکر کلام مجید میں پایا جاتا ہے، معجزہ شق القمر ہے، لیکن شاہ ولی اللہ نے تفہیمات الہیہ میں صاف صاف لکھ دیا ہے کہ اس آیت میں کسی معجزہ کا ذکر نہیں کیا گیا ہے بلکہ وہ ظہور قیامت کی علامت بتائی گئی ہے جس کی خبر رسول اللہ نے بہت پہلے سے کر دی تھی۔

بہر حال کلام مجید سے کہیں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ رسول اللہ کی طرف سے کبھی ”خوارق عادات“ ظاہر ہوئے ہوں لیکن اسی کے ساتھ میں ان کے ایک بہت بڑے معجزہ کا قایل ہوں اور وہ معجزہ ان کے عزم صمیم، بلندی اخلاق اور انسانیت گہری کا تھا، اور دنیا کے سامنے اس کو پیش کرنا چاہئے۔

اب وہ زمانہ نہیں کہ رسول اللہ کی عظمت کو ان دلائل سے ظاہر کیا جائے کہ آپ کے جسم کا سایہ نہ تھا، آپ کی رسالت کی گواہی کنکریوں نے دی۔ درختوں نے آپ کو جھک کر سلام کیا۔ بلکہ وقت کا اقتضاء یہ ہے کہ رسول اللہ کے اسوۂ حسنہ اور ان کے غیر معمولی بلند کردار کو پیش کر کے بتایا جائے کہ محمد کتنا بڑا انسان تھا اور جو تعلیم اخلاق اس نے پیش کی ہے وہ کتنی جامع، کس قدر مکمل اور کس درجہ بلند ہے۔

۱۔ ”قانون ان نومن الک — بشر رسولاً“

خط و کتابت میں نمبر خریداری لکھنا نہ بھولے۔ نمبر خریداری ہر مہینے پتہ کی چٹہر یا پٹن طرح دیتا ہے۔ منیجر نگار

## ادھر ادھر سے

**جہانگیر ایک شکاری کی حیثیت سے** یوں تو تمام شاہان مغلیہ کو شکار کا شوق تھا، لیکن جہانگیر خصوصیت کے ساتھ بڑا شائق تھا۔ اس نے اپنی ڈائری (تذکرہ جہانگیری) میں بڑی تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ اس کے زمانہ میں شکار کیونکر کھیلا جاتا تھا اور اس کے لئے کیا کیا اہتمام ہوتا تھا ایک بار راولپنڈی کے قریب کے جنگلوں میں اس نے پورا ہفتہ شکار میں بسر کیا جس کی تفصیل خود اس نے اپنے قلم سے یہ لکھی ہے کہ:-

”بابا حسن ابدال نے گھیرا ڈالنے کا انتظام کرایا تو ۲۰ سرخ ہرن اور ۶۸ سفید ہرن لکھ گئے۔ خود میں نے تیرہ کمان سے ۲۹ ہرن شکار کئے۔ پرہیز اور خرم نے بھی متعدد ہرنوں کو اپنے اپنے تیروں کا نشانہ بنایا۔ اس کے بعد درباریوں اور ملازموں کو شکار کی اجازت دی گئی۔ خان جہان بہترین نشانہ باز ثابت ہوا اور اس کا ایک نشانہ بھی خطا نہیں ہوا۔ اس نے ہر تیر کے ساتھ ایک ہرن گرایا۔“

ایک اور موقع پر ظفر خاں نے شکار کا انتظام کرایا تو اس دن جہانگیر نے ۳۴ ہرن سرخ رنگ کے اور ۳۵ ہرن سیاہ دم والے شکار کئے۔ ان کے علاوہ کئی جنگلی سٹور بھی مارے۔

شکار میں اکثر مغلیہ خواتین بھی ساتھ ہوتی تھیں۔ جہانگیر اپنے تذکرہ میں ایک جگہ لکھتا ہے:-

”۲۱ کو قلعہ رہتاس سے تین فرسخ کے اندر ایک اور ہانکے کا انتظام کیا گیا۔ اس کا اہتمام ہلال خاں کے سپرد تھا۔ میرے ساتھ خواتین بھی تھیں۔ یہ شکار بہت کامیاب رہا۔ ۲۰۰ ہرن کا شکار ہوا۔ ۲۴ کو پھر رہتاس کے مضافات میں انتظام کیا گیا۔ اس شکار میں میری بہنیں اور دوسری خواتین بھی شریک تھیں۔ اس مرتبہ ۱۰۰ ہرن ہاتھ آئے۔“

ایک اور شکار کا ذکر جہانگیر نے ان الفاظ میں کیا ہے:-

”۲۰ کو شکاریوں نے چار شیروں کا پتہ چلایا۔ ان کے شکار کے لئے میں گیا تو خواتین بھی ساتھ تھیں۔ جب شیر نظر آئے تو نور جہاں بیگم نے مجھ سے کہا کہ اگر اجازت ہو تو میں بندوق سے ان کا شکار کروں۔ میں نے اجازت دی اور جہاں بیگم نے دو غیر میں دو شیر گرا دیے اس کے بعد چشم زدن میں باقی دو شیر بھی ہلاک کر دیے اس وقت تک میں نے ایسا شکار کبھی نہ دیکھا تھا کہ ہاتھ کے اوپر ہودے میں بیٹھ کر گولی چلائی جائے اور کوئی نشانہ خطا نہ کرے۔ میں نے اس قدر انداز ہی سے خوش ہو کر نور جہاں بیگم کو ایک چٹا ونگٹن ایک لاکھ کی قیمت کا اور ۱۰۰۰ اشرفیاں دیں۔“

جہانگیر ایک جگہ لکھتا ہے کہ ۱۔

”ایک بار میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ شروع سے اس وقت تک جتنے جانور میں نے شکار کئے ہیں ان کی فہرست بنائی جائے چنانچہ میں نے اخبار نویسوں کو حکم دیا اور انہوں نے جو فہرست بنائی اس سے معلوم ہوا کہ بارہ سال کی عمر سے آج (۱۱ سن جلوس ہنگ

۲۸۵۳۲ شکار کئے ہوئے جانوروں کے میرے سامنے پیش کئے گئے۔ ان میں سے ۱۷۶۷ خود میرے شکار کئے ہوئے تھے۔

ان میں ۸۶ شیر، بچھ اور پتیا وغیرہ۔ نیل گائے ۸۸۹، بارہ سنگے ۳۵، ہرن، پتیل وغیرہ ۱۶۷۰۔ مینڈھے اور سرخ ہرن

۲۱۲۵۔ بھیڑے ۶۴۔ جنگلی بھینسے ۳۰۔ سور ۹۰۔ بڑے کوہی ۲۲۔ خرگوش ۲۳۔ چڑیاں ۱۳۹۶۴۔ کبوتر ۱۰۳۴۔ ۱۰۳۴ چیل

باز ۳۔ اگے ۳۹۔ فاختہ ۲۵۔ بطیں ۹۷۔ گھڑیاں ۷۰۔

جہانگیر نے اخیر عمر میں شکار سے توبہ کر لی تھی اس کا واقعہ وہ یوں بیان کرتا ہے کہ ۱۔

”میرے بیٹے شاہجہاں کا محبوب بیٹا شجاع، جس نے نور جہاں بیگم کی آغوش میں پرورش پائی تھی اور جو مجھے جان سے زیادہ

عزیز تھا، بیمار ہوا، بہت علاج ہوا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا، تو میں نے بارگاہ رب لعزت میں دعا کی اس وقت مجھے خیال آیا کہ

سترہ سال قبل میں نے خدا سے عہد کیا تھا کہ جب میری عمر ۵۰ سے متجاوز ہو جائے گی تو میں شکار چھوڑ دوں گا اور میں کسی کی جان

نہ لوں گا اور سوچا کہ ممکن ہے اس عہد کے پورا کرنے سے شجاع اچھا ہو جائے، چنانچہ میں نے اس پر عمل کیا اور شجاع اچھا ہو گیا۔

**انسان کی آئندہ غذا** کرہ ارض کے ماہرین آبادی اور سائنس دان، دونوں غور کر رہے ہیں کہ انسان کی آئندہ غذا کیا ہوگی۔ کیونکہ دنیا کی آبادی جس رفتار سے بڑھ رہی ہے اس سے یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ

آئندہ سو سال میں دنیا کی آبادی دو چاند یعنی تقریباً دو ارب سترہ کروڑ چالیس لاکھ ہو جائے گی اور اتنی بڑی آبادی کے لئے زمین کیونکر غلہ فراہم کر سکے گی، جبکہ اس وقت بھی یہی وقت سامنے ہے۔

ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر روجر جے کہتے ہیں کہ دنیا کی آبادی اگر پندرہ ارب بھی ہو جائے تو گھبرانے کی بات نہیں بشرطیکہ

ہم غذا کے متعلق اپنے مخصوص تصورات اور عادات کو ترک کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ خیال ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب

گوشت اور انڈا تو باقی نہ رہے گا، کیونکہ جن جانوروں سے یہ چیزیں حاصل کی جاتی ہیں ان کی نگہداشت پر بہت زیادہ خرچ

ہوتا ہے، اسی طرح زمین بھی اتنا غلہ نہ فراہم کر سکے گی کہ پوری آبادی کے لئے کافی ہو، اس لئے لامحالہ ہم کو کیمیائی غذاؤں

سے کام لینا پڑے گا۔

انسان کی بقا حیات کے لئے مادہ پروٹین کی سب سے زیادہ ضرورت ہے جو نو سارا لی تر شاہ (Ames) سے

آسانی حاصل کیا جاسکتا ہے اور یہ تر شاہ، ٹائٹروجن سے پیدا ہو سکتا ہے جو ہوا

میں بکثرت موجود ہے۔

انسان کو چربی کی بھی ضرورت ہے سو وہ کوئلہ سے حاصل ہو سکتی ہے۔ پھل لڑائی میں جرمنی نے کوئلہ ہی سے

چربی بنائی تھی اور ایک امریکن پروفیسر کا خیال ہے کہ آئندہ کوئلہ صرف غذائی مادہ ہی کی صورت سے استعمال کیا جائے گا۔

انسان کے نشوونما کے لئے شکر اور نشاستہ کی بھی ضرورت ہے، جو جنگلی درختوں سے میسر آسکتے ہیں اور جن کا تجربہ ہو چکا ہے۔ کپڑے بھی اسی طرح جنگلی درختوں کے ریشوں سے طیار ہوں گے۔ یہ وہ وقت ہوگا جب مشینیں چلانے اور روشنی حاصل کرنے کے لئے بجلی سے کام نہ لیا جائے گا بلکہ ریڈیو کی شعاعوں سے یہ سب کچھ ہو سکے گا۔

جارج شاہ انگلستان کے ذاتی ملازموں کی تعداد ۵۰۰ ہے جن کو وہ اپنے پاس سے تنخواہ دیتے ہیں۔ ان میں سے اکثر ایسے معرور خطاب یافتہ لوگ بھی ہیں جن سے کبھی کبھی خاص تقریروں ہی کے وقت کام لیا جاتا ہے۔

۴۰ عورتیں صرف محل کا فرش صاف کرنے کے لئے متعین ہیں اور ایک شخص کا کام صرف یہ ہے کہ وہ محل شاہی... اگھڑیوں میں چابی دیا کرے۔

بادشاہ کا سالانہ الاؤنس ۱۳۴۰۰ پونڈ ہے جس سے وہ اپنے خانگی ملازمین کی تنخواہیں ادا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ۱۵۲۸۰۰ پونڈ سالانہ ان کے مصارف خورد و نوش وغیرہ کے لئے ملتا ہے۔

یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ محلات شاہی کی وسعت کیا ہے اور ان پر کتنی رقم صرف ہوتی ہے۔ قصر بکنگھم جہاں شاہی خاندان کا اکثر قیام رہتا ہے، اس کے لئے ڈاک خانہ، ستھانہ اور آگ بجھانے کا بریگیڈ علاحدہ ہے۔ قصر وینڈسرسر جہاں بادشاہ کبھی کبھی جا کر ہفتوں قیام کرتے ہیں، ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جس کی بیرونی فصیل کا دور ایک میل ہے۔

قصر بالمورل اور قصر سنڈرنگھم بہت کم استعمال ہوتے ہیں لیکن ملازمین کا اسٹاف وہاں بدستور موجود رہتا ہے۔ قصر بکنگھم کے جواہرات کی حفاظت کے لئے جن کی قیمت ۴۰ لاکھ پونڈ ہے ایک مستقل جماعت محافظین کے متعین ہے۔

محل میں دس ہزار کھڑکیاں ہیں جن کے صاف رکھنے کے لئے ہارہ آدمی علاحدہ مقرر ہیں۔

## ”مجموعہ استفسار و جواب“ کی تیسری جلد

جس کی قیمت علاوہ محصول تین روپیہ تھی، اب معہ محصول صرف دو روپیہ میں مل سکتی ہے اور اگر آپ نگار کی سالانہ خریداری منظور فرمائیں تو صرف ایک روپیہ ہیں۔

منیجر نگار

## صحرائی

مہ جبینوں کے تعلق کی مجھے پیاس نہیں!  
 میں مقرر نہیں، عاشق نہیں، عکاس نہیں،  
 مجھ کو رنگین تصنع کی ہوا راس نہیں  
 رقص گا ہوں کی تجلی سے اندھیرا اچھا  
 شہر کی رات سے جنگل کا سویرا اچھا  
 قصر و ایوان سے خیموں میں بسیرا اچھا  
 اطلس و ریشم و سنجاہ سے ٹیلے اچھے  
 دام خوش رنگ سے پرواز کے حیلے اچھے  
 ماہ پاروں سے پرندوں کے قبیلے اچھے  
 ساغر سے ستاروں کی تجلی بہتر  
 ہوش کی میند سے آنکھوں کی تسلی بہتر  
 ساز کی گونج سے لہروں کی تعلق بہتر  
 دشت و کلزار سے بہتر نہیں ساتھی کوئی  
 بے ریا خلق کا پیکر نہیں ساتھی کوئی  
 اتنا مانوس و مدبر نہیں ساتھی کوئی  
 مست لہروں سے زیا وہ نہیں دلبر کوئی  
 اس قدر دلکش و سادہ نہیں دلبر کوئی  
 عارف منزل و جادہ نہیں دلبر کوئی  
 سار بانوں کے ترانے ہیں پیامی میرے  
 شبنم و رنگ کے سلطان ہیں حامی میرے  
 ہنس کے ملتے ہیں مجھے حافظ و جامی میرے  
 ابن صحرا ہوں، بگولے ہیں تفتن میرا  
 شہر کے نام سے ڈرتا ہے تمدن میرا

## کے "الزام" دول؟

اب بھی طاری ہے وہی ذروں سے تاروں تک جمود  
اب بھی ہے گم کردہ منزل کار و این ہست و بود  
اب بھی ہے بے کیف سی ہانگ و ف و چنگ و سرود

محشرستانِ تعصب ہے سکوں زارِ وطن  
لیکن اس بیجا تعصب پر کسے الزام دول

ہیں دماغوں میں وہی ناسورِ شخصیت ابھی  
ہیں کچھ انسانوں میں اوصافِ بہیمیت ابھی  
سب بدل جانے پہ بھی بدلی نہیں نیت ابھی

چاہئے جمہوریت کی ذمہ داری کا بھی ہوش  
لیکن اس غوئے تغافل پر کسے الزام دول؟

کچھ طبیعت میں ہیں خونیں حوصلے باقی ابھی  
نا سزاؤں نا ملائم دلوں باقی ابھی  
ہیں وہ ناقوسِ دافاں کے مرحلے باقی ابھی

ورنہ کیوں دست و گریباں ہیں ہم ابنائے قوم  
لیکن اب اس خانہ جنگی پر کسے الزام دول

اب بھی ہیں لبریز خوں سے لالہ و گل کے سبب  
اب بھی آغوشِ خزاں میں ہے بہارِ رنگ و بو  
اب بھی پانی سے کہیں ارزاں ہے انسان کا لہو

اب بھی ہے چنگیزیت سے عصرِ حاضر کو شغف  
لیکن اس چنگیز خانی پر کسے الزام دول

ہر نفس پر اب بھی وحشت کے برس پڑتے ہیں تیر  
اب بھی ہیں انسانیت میں شیطنیت کے کچھ خمیر  
اب بھی ہیں ناپاک جذبے اور وہی گندے ضمیر

اب بھی ہوتی ہے غلامانہ روایت کی نمود  
لیکن اس طرزِ غلامی پر کسے الزام دول

اب بھی جلتے ہیں ضمیروں میں تعصب کے چراغ  
اب بھی جہل و ابلہی کے ثبوت ہیں چہروں پہ داغ  
بادہ جمہوریت سے اب بھی خالی ہیں ایاغ

بچتے پھرتے ہیں فرزندِ وطن اپنا ضمیر  
لیکن اس قومی تجارت پر کسے الزام دوں

آج بھی ہے اشتراکِ درد کا بربطِ خموش  
اب بھی سینوں میں نہیں حفظِ اقلیت کا جوش  
آج بھی موجود ہیں اقوام میں لہاں فروش

آڑ میں ٹٹی کے کھیلا جا رہا ہے یہ شکار  
لیکن اس مکرِ سیاست پر کسے الزام دوں

ہیں وہی سینوں میں غداری کے منصوبے ابھی  
تشنہ تکمیل ہیں آئین کے شعبے ابھی  
بھیڑے ہیں بیشہ تہذیب میں پیٹھے ابھی

ہیں ضمیروں میں بغاوت کے ابھی شعلے نہاں  
لیکن اس جرمِ بغاوت پر کسے الزام دوں

ذہن گیتی پر کھر چھایا ہوا ہے آج بھی  
اب بھی باقی ہے عوامی ذہنیت میں برہمی  
کروٹیں لیتی ہے اب بھی چار سو شورش وہی

آج بھی ہے زندگی اک وحشیانہ موڑ پر  
لیکن اس وحشی تمدن پر کسے الزام دوں

شخصیت آہنگ ہے آئینِ جمہوری ابھی  
عین مرکز پر بھی مرکز سے ہے کچھ دوری ابھی  
ہیں مرادون لفظ "آزادی و مجبوری" ابھی

ملک میں فرقہ پرستی کے عناصر ہیں ابھی  
لیکن اس فرقہ پرستی پر کسے الزام دوں

ایشیا کے اتنے انسانوں پہ کیا گزری نہ پوچھ !  
ملک و ملت کے شہستانوں پہ کیا گزری نہ پوچھ !  
مسجدوں پر اور منمنیوں پہ کیا گزری نہ پوچھ !

عہدِ وحشت کی یہ باتیں کتنی غم انگیز ہیں  
لیکن اس وحشی کہانی پر کسے الزام دوں

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما

# کر بلا

ہمنشیں یہ تو علامت ہے جگر داری کی      یہ تو اک جلوہ گہ نقش وفا ہے اسے دوست  
یہ تو اک حق و صداقت کا ہے جاوید نشان      یہ تو اک جاوہ تسلیم و رضا ہے اسے دوست  
اور وہ آتے ہیں بس رو کے چلے جاتے ہیں

یہ تو سرچشمہ ہے اک - قوت ایمانی کا      یہ تو اک درس ہے حق گوئی و سربانی کا  
یہ تو اک نور ہے باطل کے اندھیروں کے لئے      یہ تو اک عہد ہے تحبید مسلمانوں کا  
اور وہ آتے ہیں بس رو کے چلے جاتے ہیں

یہ تو اک پاک کسوٹی ہے عدالت کے لئے      یہ تو معیار ہے اک حق خلافت کے لئے  
یہ تو ایثار و اطاعت کی ہے اک زندہ مثال      یہ تو اک خم ہے مئے جام شہادت کے لئے  
اور وہ آتے ہیں بس رو کے چلے جاتے ہیں

یہ تو ہے ایک امانت گہ شمشیر و کتاب      یہ تو تاریخ امم کا ہے درخشاں اک باب  
یہ تو اعلان ہے انسان کی آزادی کا      یہ تو ہے قوت باطل کے لئے حق کا جواب  
اور وہ آتے ہیں بس رو کے چلے جاتے ہیں

یہ تو اتمام ہے اک قبلہ گہ اولیٰ کا،      یہ تو پیغام عمل ہے حرم گہرے کا  
یہ تو تعلیم ہے اک حق کی نیابت کے لئے      یہ تو مقصود ہے انسانیت اعلیٰ کا  
اور وہ آتے ہیں بس رو کے چلے جاتے ہیں

یہ تو اک دعوت حق ہے بسیہ گاہ یزید      یہ تو اک کفر کی ظلمت میں ہے شمع توحید  
یہ تو میزان ہے اک جنس وفا کی لے دوست      ہمنشیں یہ تو ہے اک سرخی پیغام شہید  
اور وہ آتے ہیں بس رو کے چلے جاتے ہیں

یہ تو اک راہ ہے انسان کی بھلائی کے لئے      یہ تو دستور ہے اک ساری خدائی کے لئے  
یہ تو تشریح ہے اک رمز الہی کی،      یہ تو آئین ہے اک راہ نمائی کے لئے  
اور وہ آتے ہیں بس رو کے چلے جاتے ہیں

تنویر احمد علوی

## ساتر بھوپالی :-

ہے عجیب کشمکش میں غم آرزو کا مارا  
میں نہیں ہوں موج مضطرب ہو بے قرار ساحل  
مجھے کیا مٹا سکیں گے غم ہجر کے یہ طوفاں  
نہ کہیں کا مجھ کو رکھا تری آرزو نے ظالم  
ترے پوچھنے کے صدقے، غم دل کا ماجرا کیا  
ترے لطف نے جلایا، تری بے رخی نے مارا  
ہے عجیب چیز ساغر، یہ مقدر و فنا بھی  
کہ اُسی کو ہم نے چاہا جو نہ ہو سکا ہمارا

## اکرم دھولوی :-

کبھی سکون کبھی اضطراب کیا معنی  
نہیں جو حسن و محبت میں ایک ربط لطیف  
فروپ وعدہ فردا حسین سہی لیکن  
ضرور اس کو خبر میرے شوق دید کی ہے  
خزاں کا خوف نہیں بچلیوں کا ڈر بھی نہیں  
خیال ضبط محبت بھی چاہئے اکرم  
زباں پہ تذکرہ اضطراب کیا معنی

## جگن ناتھ آزاد :-

یہی مجھ سے ہو سکا ہے کہ ہے آرزو فراداں  
یہ جو دل کی کیفیت ہے نہیں راز اگر تو کیا ہے  
کوئی ایک ان میں چُن لے کہ جہان زندگی میں  
یہ بتا رہے ہیں مجھ کو مری ہر غزل کے تیور  
مرے درد کی لطافت ہے تری نظر کا پر تو  
مری ہر نوائے غم میں ترے سوز کی جھلک ہے  
یہ نگاہ کے ہیں تیور یہ خیال کے ہیں پہلو  
یہی زندگی چمن ہے یہی زندگی بیاباں

|                                  |                               |                             |                          |                                  |
|----------------------------------|-------------------------------|-----------------------------|--------------------------|----------------------------------|
| مکتوبات نیاز تین حصوں میں        | شہاب کی سرگزشت                | جذبات بھاشا                 | فلاسفہ قدیم              | شاعر کا انجام                    |
| ادبی نگار کے تمام خطوط جو        | حضرت نیاز کا دو عظیم النظر    | جناب نیاز نے ایک کچپ        | اس مجموعہ میں حضرت نیاز  | جناب نیاز کے غفوان شہاب          |
| جذبات نگاری سلاست بیان           | افسانہ جو اردو زبان میں بالکل | متہد کے سب سے بہترین ہندی   | کے دو علمی مضامین شامل   | لکھا ہوا افسانہ حسن عشق کی       |
| رنگینی اور البیلے بن کے طاق سے   | پہلی مرتبہ سیر نگاری کے اصل   | شاعری کے نمونے پیش کر کے    | ہیں۔                     | تمام نشہ بخش کیفیات اس کے        |
| غزل نگاری میں بالکل پہلی چیز ہیں | پر لکھا گیا ہے اس کی زبان     | انہی اسی تشریح کی ہے کہ دل  | ۱۔ چند گھنٹے فلاسفہ قدیم | ایک ایک جملہ میں موجود ہیں یہ    |
| جکے سانسے خطوط غائب بھی پھیکے    | و تخیل اس کی نزاکت بیان       | قیاب ہو جاتا ہے اردو میں    | کی روحوں کے ساتھ         | افسانے پلاٹ اور انشاء کے         |
| سلو محبت ہیں ان ادبیتوں میں      | اسکی بلند می مضمون اور اسکی   | یہی سب سے پہلی کتاب اس      | ۲۔ ماؤنٹین کا مذہب       | لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ    |
| پہلے ادبیت کی غلطیوں کو دور      | انشار عالیہ سحر حلال کے درجہ  | موضوع پر لکھی گئی ہے جس میں | نہایت مفید و کچپ         | دوسری جگہ اسکی نظیر نہیں مل سکتی |
| کر دیا گیا ہے۔ اور پڑھ کاغذ      | مک پہنچتی ہے۔                 | ہندی کلام کے بے مثل نمونے   | کتاب ہے۔                 | تازہ ادبیت نہایت صحیح و          |
| پر طبع ہوئی ہے۔ قیمت حصہ اول     | یہ ادبیت نہایت صحیح اور خوشخط | نظر آتے ہیں۔                | قیمت ۱۔                  | خوشخط سرورق رنگین۔               |
| دوم فی حصہ تین روپیہ حصہ         | قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے        | قیمت بارہ آنے               | ایک روپیہ                | قیمت بارہ آنے                    |
| چار روپیہ علاوہ محصول            | علاوہ محصول                   | علاوہ محصول                 | علاوہ محصول              | علاوہ محصول                      |

|                           |                                    |                             |                                  |                                    |
|---------------------------|------------------------------------|-----------------------------|----------------------------------|------------------------------------|
| فرست الید                 | نقاب اٹھ جانے کے بعد               | مذاکرات نیاز                | انتقادات (دو حصے)                | مذہب                               |
| مولد نیاز فتح پوری میں کے | نیاز فتح پوری کے تین افسانوں       | یعنی حضرت نیاز کی ڈائری     | حضرت نیاز فتح پوری کے انتقادی    | حضرت نیاز کا وہ معرکہ الکرام مقالہ |
| مطالعہ سے ایک شخص آسانی   | کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ   | جو ادبیات تنقید عالیہ کا    | مقالات و حصوں میں تقسیم کئے      | جس میں انھوں نے بتایا ہے           |
| ہاتھ کی شناخت اور اس کی   | ہمارے ملک کے ہادیان طریقت و        | عجیب و غریب خیرہ ہے ایک بار | گئے ہیں پہلے حصہ میں وہ مقالہ    | کہ مذہب کی حقیقت کیا               |
| لکھروں کو دیکھ کر اپنے    | یا علماء کرام کی اندرونی زندگی کیا | اس کو شروع کر دینا اخیر تک  | ہیں جن میں خاص شعرا کے کلام      | ہے اور یہ دنیا میں کیونکر          |
| دوسرے شخص کے مستقبل       | ہے اور ان کا وجد ہماری سائیں       | پڑھ لینا ہے۔ یہ بھی جدید    | پر تنقید کی گئی ہے مثلاً مومن    | راکج ہوا۔                          |
| سیرت عروج و زوال امت      | و اجتماعی حیات کیلئے کس بجہ        | ادبیت ہے جس میں صحت اور     | ظفر غالب، مصحفی، نظیر حسین       | اس کے مطالعہ کے بعد                |
| حیات صحت و بیماری         | سم قائل ہو زبان، پلاٹ و            | نفاست کا غرض طباعت کا       | جوش، مغرور وغیرہ وغیرہ دوسرے حصہ | انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے         |
| شہرت و نیکنامی پر صحیح    | انشار کے لحاظ سے جو مرتبہ ان       | خاں ہتھام کیا گیا ہے۔       | میں عام ادبی و انتقادی شبائیں    | کہ مذہب کی پابندی کیا              |
| پیشین گوئی کر سکتا ہے     | افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے        | قیمت ۲۔                     | جس کا تعلق شعروادب کی تاریخ      | معنی رکھتی ہے۔                     |
| قیمت ایک روپیہ            | سے تعلق رکھتا ہے قیمت آٹھ آنے      | ایک روپیہ آٹھ آنے           | سے ہے قیمت حصہ اول للہ           | قیمت ایک روپیہ                     |
| علاوہ محصول               | علاوہ محصول                        | علاوہ محصول                 | حصہ دوم للہ علاوہ محصول          | علاوہ محصول                        |

# ”نگار“ کے خاص نمبر

| جنوری، فروری ۱۹۳۶ء                                                                                                                                                                                                                                                                                                                        | جنوری ۱۹۳۶ء                                                                                                             | فروری، مارچ ۱۹۳۶ء                                                         |
|-------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|-------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|---------------------------------------------------------------------------|
| نگار ۳۸ سالہ ادبی و تنقیدی خدمات کا پچوڑ جس میں ۱۹۳۶ء سے لیکر ۱۹۳۶ء تک کے تمام تنقیدی رجحانات اور انتقادی نمونوں کو واضح کیا گیا ہے، اس میں بعض ایسے اکابر شعراء کا تذکرہ و انتخاب کلام بھی شامل ہے جن کے حالات عام طور پر معلوم نہیں ہیں اور جن کا کلام نایاب ہے۔ اس میں جدید تنقیدی میلانات اور ترقی پسند نقادوں کے مقالات بھی شامل ہیں | اس نمبر میں ریاض خیر آبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بنایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔ | جو فن انتقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے |
| قیمت تین روپیہ علاوہ محصول                                                                                                                                                                                                                                                                                                                | قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول                                                                                              | قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول                                        |

| جنوری ۱۹۳۶ء                                                                                                                                                                      | فروری، فروری ۱۹۳۶ء                                                                                                                                                                                               | فروری، فروری ۱۹۳۶ء                                                                                                                                                                                                                  |
|----------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|-------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|
| اس سال کا نام ”ماجدلین نمبر“ ہے جس میں ایک نیشنل فرینسیسی ادیب کی ایک شاہکار ترجمہ کی کو اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ ادب اور جذبات نگاری کے لحاظ سے یہ ناول اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ | پاکستان نمبر نگار کا جو بی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت فتنہ اور تمدن اسلام کے بلند مقامات کو پیش کیا گیا ہے جو کہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر وقت اسلام کے دور زریں اور ان کا ناموں نہ بھولنا چاہیے۔ | نگار کا افسانہ نمبر جو جس میں تقریباً تیس نئے بہترین اہل قلم کے شائع کئے گئے ہیں اس سال کی خصوصیت یہ ہے کہ اسکے مطالعے سے آسانی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور ہر اسکول کی معیاری فسانہ کیسا ہونا چاہیے۔ |
| قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول                                                                                                                                               | قیمت تین روپیہ علاوہ محصول                                                                                                                                                                                       | قیمت دو روپیہ علاوہ محصول                                                                                                                                                                                                           |

## نرخ نامہ اجرت اشتہار

| ایک سال               | چھ ماہ   | تین ماہ  | ایک ماہ |
|-----------------------|----------|----------|---------|
| ایک صفحہ ۶۰ روپیہ     | ۳۰ روپیہ | ۱۵ روپیہ | ۵ روپیہ |
| آدھ صفحہ ۳۰ روپیہ     | ۱۵ روپیہ | ۷ روپیہ  | ۲ روپیہ |
| چوتھائی صفحہ ۱۵ روپیہ | ۷ روپیہ  | ۳ روپیہ  | ۱ روپیہ |

## ”نگار“ کی قیمت

سالانہ پاکستان پاکستان کے اندر چھ روپیہ بیسٹما ہی جاری نہیں ہو سکتا۔ سالانہ بیرون ہند بارہ روپیہ (نوٹ) رسالہ ہر ماہ کی، اترار تک ایک شاخ ہوتا ہے اور ہر تک اطلاق آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے، ورنہ پھر کسی طرح نہیں مل سکتا۔ ”منجر“

کمیشن وغیرہ کی مزید تفصیلات اور قواعد طلب کیجئے۔ ”منجر“

جو آپ کے گٹ بھیجنا فروری ۱۹۳۶ء اور خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل و شوار ہے

جو خط و کتابت کے لئے مندرجہ ذیل پتہ پر بھیجنا چاہئے۔ ایسی ہی